اجتہاد اور تقلید

[عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

اردو ترجمہ و تحقیق

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

'عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ (۱۱۱۴۔۱۱۷۶ھ) کا ایک معرکۃ الآراء رسالہ ہے۔ یہ بظاہر مختصر لیکن اپنے موضوع پر بہت ہی جامع اور حاوی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اسے 'بقامتَ کہتر اور بقیمت بہتر' قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس میں نہ صرف اجتہاد اور تقلید کے نازک موضوع پر نہایت ہی متوازن اور معتدل رائے پیش کی ہے، بلکہ اجتہاد اور تقلید کے مصداقات کی تعیین میں معقولیت بھرا انداز اختیار کیا ہے۔ پھر اپنی رائے کو قرآن وسنت کی ڈگر سے ہٹنے نہیں دیا ہے۔

اس رسالہ میں اجتہاد اور تقلید سے جڑے کئی مہتم بالشان مسئلوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور ان پر اختصار کے ساتھ لیکن بہت شافی گفتگو کی گئی ہے۔ رسالہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عربی کے تیس چالیس صفحات کے اس رسالہ میں فقہ واصول اور بعض دیگر فنون کے پچاس سے زائد مراجع کے اقتباسات اور حوالے مصنف نے درج کیے ہیں، جن میں بعض مراجع ایسے بھی ہیں جو اب تک مخطوطہ ہیں۔ مصنف نے متعدد اختلافی مسئلوں پر علماء کی رائیں نقل کی ہیں اور پھر اپنا محاکمہ درج کرتے ہوئے نہ صرف قابل عمل رائے دی ہے، بلکہ متعارض آراء میں سے ہر رائے کا مصداق بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

کیا اجتہاد ہر شخص کے لئے ضروری ہے؟ جزوی اجتہاد کب لازم ہوتا ہے؟ تقلید کا کیا مطلب ہے؟ کس نوع کی تقلید حرام ہے؟ اور تقلید میں کیسی عظیم مصلحت ہوتی ہے؟ عوام کس مسلک کی پابندی کریں؟ مسلک کی تبدیلی درست ہے یا نہیں؟ مسائل میں اختلاف کی کیا

نوعیت ہے؟ اختلاف مجتہدین میں برحق رائے کیا ہے؟ اور اختلافی مسئلہ میں فتوی کس طرح دیا جائے؟ یہ اور ان جیسے متعدد اہم نکات پر مصنف نے فاضلانہ بحث کی ہے، جو علم و تحقیق سے پر بھی ہے اور واضح طور پر قابل عمل بھی۔

عربی رسالہ 'عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود ملک کے اندر اہل علم کے درمیان متداول نہیں ہے۔ بعض قدیم مطبوعہ نسخے جو ملک کی اہم لائبریریوں میں موجود ہیں، وہ بھی عمومی طور پر علماء اور طلبائے علم کے استفادہ میں نہیں ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر راقم سطور نے بہ توفیق الٰہی عربی متن کی خدمت کا ارادہ کیا۔ حسن توفیق سے مکتبہ علامہ شبلی نعمانی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تین مخطوطے، مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری علی گڑھ، کے دو مخطوطے اور مکتبہ آصفیہ حیدر آباد، کے شعبہ مخطوطات شرقیہ کے ایک مخطوطہ سے استفادہ اور تقابل و تصحیح متن کا موقع فراہم ہوا۔ متن کے اقتباسات کے تقابل اور نقل حوالہ کے وقت طلب کام اور زائد از پچاس شخصیات کے تراجم نیز آیات و روایات کی تخریج وغیرہ کے کام انجام پائے۔ ذیلی عناوین اور جدید اسلوب کے کمپیوٹر کتابت کے بعد یہ نسخہ اب ہدیہ قارئین ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے باعث آسانی استفادہ بنائے، آمین۔

اس رسالہ کے اردو ترجمے بھی متعدد بار ہوئے، ان میں ایک اہم ترجمہ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی کا 'سلک مروارید' ہے، جو مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۰ھ میں عربی متن کے ساتھ طبع ہوا تھا۔ دوسرے تراجم میں مطبع محمدی لاہور کا ترجمہ (بغیر ذکر مترجم کے)، ترجمہ مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی (قرآن محل کراچی ۱۳۹۷ھ)، ترجمہ محمد عبدالشکور فاروقی اور ترجمہ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی (شریعہ اکیڈمی لاہور ۱۴۲۱ھ) ہیں۔ ان تراجم کی زبان قدیم ہے اور یہ بہ سہولت دستیاب بھی نہیں ہیں۔ ان میں آخر الذکر ترجمہ نسبتاً جدید ہے؛ لیکن اغلاط سے وہ بھی خالی نہیں ہے۔

اجتہاد اور تقلید کا موضوع یوں تو بہت قدیم ہے، لیکن گہرے علم کی کمی اور فکری افراط وتفریط کی وجہ سے یہ موضوع بار بار زیر بحث آتا ہے، بلکہ امت مسلمہ کی صفوں میں اس حوالے سے انتشار و افتراق پیدا کرنے کی نادانستہ صورتیں بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔ پھر یہ مسئلہ علمی نہ رہ کر عوامی بن جاتا ہے، اور اس سے نہ صرف امت مسلمہ کا ناتواں جسم مزید زخم سہنے پر مجبور ہوتا ہے؛

بلکہ غیروں میں اس کی جگ ہنسائی بھی ہوتی ہے۔ ایسے میں ابھی اس بات کی شدید ضرورت باقی ہے کہ علمی سطح پر اس نازک مسئلہ کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ زیر نظر ترجمہ اس مقصد کے لئے انتہائی کار آمد علمی دستاویز ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم شخصیت کے قلم سے ہے جسے ہمارے تمام مکاتب فکر اپنا علمی مقتدا مانتے ہیں۔ راقم کا بجا احساس ہے کہ گوکہ علمی اختلاف ابتداء سے قائم رہے ہیں، اور آج بھی باقی رہیں گے؛ لیکن اس رسالہ میں جو تفصیلی رائے پیش کی گئی ہے، اس پر اہل علم کا اتفاق ہوسکتا ہے۔ اور یہ رائے امت کے ہر طبقہ خواہ وہ علماء ہوں، تعلیم یافتہ طبقہ ہو یا عوام الناس، ہر ایک کے لئے قابل عمل ہے۔ اس رائے میں ہدایات نبوی کی بھرپور اتباع ہے، فقہی مسالک کا پورا احترام ہے اور مسلکی شدت سے گریز کے ساتھ احکام شریعت کی پاسداری ہے۔

رسالہ کی اسی ضرورت اور اہمیت کے احساس کے تحت راقم نے اس کا ایک نیا اور بہتر ترجمہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ترجمہ میں درج ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے:

☆ ترجمہ کو لفظ سے قریب رکھتے ہوئے سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆ قوسین کے اندر ذیلی عناوین کا اضافہ کیا گیا ہے؛ تاکہ زیر بحث مطلب کا اندازہ بہ یک نظر ہو جائے۔

☆ رسالہ کی عبارات اور اقتباسات کو جدید انداز کتابت پر تحریر کیا گیا ہے۔

☆ فقہی اقتباسات کے حوالے تلاش کئے گئے اور انھیں جدید اصول تحقیق کے مطابق درج کیا گیا ہے۔

☆ قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے درج کئے گئے ہیں۔

☆ رسالہ میں ذکر ہونے والی پچاسوں شخصیات کے مکمل نام اور تاریخ پیدائش/وفات ذکر کی گئی ہیں۔

☆ متن کے اندر بعض واقعات کی جانب اشارے ہیں، قوسین میں ان کی توضیح ذکر کی گئی ہے۔

واضح رہے کہ یہ وہ امور ہیں جو رسالہ کے عربی متن میں نہیں تھے، ترجمہ میں استفادہ کی سہولت کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔ البتہ اس بات کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے کہ مترجم کا کوئی اضافہ مصنف کی عبارت میں خلط ملط نہ ہونے پائے، اسی لئے ذیلی عناوین اور شخصیات کے مفصل نام وسنین وغیرہ سب قوسین کے اندر رکھے گئے ہیں۔

ان خدمات اور کوششوں کے ساتھ یہ ترجمہ اہل علم کی خدمت میں پیش ہے۔ انسان کی کوئی بھی کوشش خطا سے مبرا نہیں کہی جا سکتی ہے۔ اپنی وسعت بھر تمام کوششوں کے باوجود اس بات کا امکان موجود ہے کہ عبارت کی تفہیم میں یا ترجمہ کے الفاظ سے مفہوم کی ادائیگی میں راقم کے ذہن یا قلم نے ٹھوکر کھائی ہو۔ ایسی کسی بھی نشاندہی کے لئے راقم اہل نظر کا شکر گزار رہوگا۔

معروف فقیہ وقت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم نے اس رسالہ کے لئے اپنا انتہائی مصروف اور قیمتی وقت فارغ فرمایا، اور رسالہ کے موضوع پر نہایت ہی وقیع و عالمانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے، اس مقدمہ کو پڑھ کر راقم کا احساس ہے کہ اس میں نہ صرف اجتہاد و تقلید کے موضوع پر انتہائی واضح و جامع اور معتدل فکر سمٹ کر آ گئی ہے؛ بلکہ اس میں رسالہ کا خلاصہ بھی سما گیا ہے، اور امت مسلمہ اور اس کے اداروں و مسالک کے لئے اتحاد مسالک کا لائحہ عمل پیش کر دیا گیا ہے۔ مولانا مدظلہ کی تحریر میں علم کی گیرائی، فکر کی وسعت اور قلب کی دردمندی سطر سطر سے نمایاں ہے۔ ہم اس علمی نوازش اور دینی خدمت کے لئے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کے انتہائی ممنون ہیں، اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کا سایہ امت پر تادیر قائم رکھے، آپ کی ذات سے استفادہ کو مزید عام کرے، اور اتحاد امت و مسالک کی جو تمنا اور سعی آپ فرما رہے ہیں وہ جلد روبہ عمل آئے، آمین۔

اس ترجمہ سے مقصود دین اور علم کی خدمت ہے۔ اگر یہ عمل بارگاہ بے نیازی میں شرف قبولیت پاتا ہے تو یہ راقم آثم پر رب کریم کے بے پایاں احسانات میں ایک اور اضافہ ہوگا، جس کا دائم خواستگار اور ہمہ وقت متمنی ہوں۔

محمد فہیم اختر ندوی
اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ حیدرآباد

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
۴/اپریل ۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، دامت برکاتہم

(جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا وسکریٹری، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

اسلام کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری پر ہے، جو ذات خالق ومالک ہے، وہی اس لائق بھی ہے کہ لوگوں کے لئے احکام دے اور وہی احکام اس لائق ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے، انہیں احکام کو اپنے بندوں تک پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل فرمائیں اور انسانوں ہی میں سے اپنے انبیاء ورسل بھیجے، جس کا سلسلہ حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوگیا، احکام الٰہی کو جاننے کے ذرائع بنیادی طور پر دو ہیں: کتاب اللہ اور سنت رسول، ان دونوں کا حجت ودلیل ہونا خود قرآن مجید سے ثابت ہے، پھر قرآن وحدیث سے اخذ واستنباط کے بنیادی طریقے دو ہیں: اجماع اور قیاس، قیاس میں قرآن وحدیث کی امثال ونظائر کو سامنے رکھ کر نئے واقعات ومسائل کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے، اور اجماع قرآن وحدیث اور قیاس کی بنیاد پر معتبر فقہاء کے اتفاق سے عبارت ہے، اس طرح کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس چار ادلۂ شرعیہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، باقی جو ضمنی ادلہ ہیں، وہ دراصل ان ہی ادلۂ اربعہ سے ماخوذ ہیں۔

ان ادلہ کے ذریعہ احکام شریعت کو جاننے اور ان پر عمل کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ عمل کرنے والا خود صاحب علم ہو اور وہ احکام شریعت تک اپنے علم وتفقہ کی بنا پر رسائی رکھتا ہو، دوسرا گروہ وہ ہے جو خود اس کی استعداد نہیں رکھتا اور وہ ان کو جاننے میں اہل علم کا محتاج ہے، چنانچہ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے شریعت میں اجتہاد کی گنجائش رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے فقہاء کو اجتہاد کی ترغیب دی، اس سلسلہ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت معروف

ہے۔(دیکھئے:سنن أبی داؤد، کتاب الأقضیة، باب اجتهاد الرأي في القضاء،حدیث نمبر:۳۱۱۹)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اجتہاد بہت ہی قابل اجر عمل ہے، اگر اجتہاد کرنے والا صحیح نتیجہ پر پہنچ گیا تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے اور اگر باوجود کوشش اور صلاحیت اجتہاد کے اس سے خطا ہوگئی، تب بھی اس کے لئے ایک اجر ہے:"إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب فله أجران وإذا حكم فاجتهد فأخطأ فله أجر" (سنن أبي داؤد، كتاب الأقضية، باب في القاضي يخطأ ،حدیث نمبر:۳۱۰۳)،رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ خطاء اجتہادی پر اگر دوسرا شخص عمل کرے تو وہ بھی اجر کا مستحق ہوگا؛ کیوں کہ جب صاحب علم کی خطا معاف ہوتو جوعلم سے محروم ہو اس کی خطا بدرجہ اولیٰ معاف ہوگی۔

اجتہاد درحقیقت اس امت کی خصوصیات اور اس کے فضائل میں سے ہے، پہلی امتوں میں احکام شریعت کی وضاحت خود انبیاء کیا کرتے تھے، ایک نبی کے جانے کے بعد اور بعض اوقات ان کی زندگی ہی میں دوسرا نبی آجاتا تھا اور پیغمبر وحی کی بنیاد پر رہنمائی کرتے تھے، اس امت کے علماء کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز بخشا ہے کہ وہ خود احکام شریعت کو اخذ کریں اور اس کے مطابق امت کی رہنمائی کریں، —— آج کل عام طور پر یہ بحث کی جاتی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے یا بند ہو چکا؟ لیکن یہ حقیر اس بحث کو عبث سمجھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہر فن میں ایک مقام ایسا آتا ہے، جہاں اس کا ارتقاء مکمل ہو جاتا ہے، فقہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، اس پر ایک ہزار سال سے زیادہ بہترین ذہانتیں صرف ہوئی ہیں؛ اس لئے اجتہاد مطلق کی ضرورت باقی نہیں رہی، نہ یہ کہ کسی نے اس دروازہ کو بند کردیا؛ البتہ نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی ضرورت اب بھی باقی ہے اور یہ ضرورت قیامت تک باقی رہے گی، فقہاء نے تخریج اور ترجیح کی جوصورت بیان کی ہے، وہ دراصل اجتہاد کی اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے، جس دروازہ کو رسول اللہ ﷺ نے کھولا ہے، امت کے کسی شخص کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے بند کردے؛ لیکن یہ پہلو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شریعت کے احکام کی بنیاد ضرورت و مصلحت پر ہے، جب ضرورت پوری ہوجائے تو اس عمل کو باقی رکھنا عبث ہے۔

جو لوگ خود ادلہ شرعیہ سے اخذ و استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہیں ہے کہ اس فن کے ماہرین سے رہنمائی حاصل کر کے عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، تقلید کا مقصد علماء کی تشریحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن وحدیث پر عمل کرنا ہے، دین و دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جو تقلید و اتباع سے خالی ہو، ہم امراض کے بارے میں ڈاکٹر پر اعتماد کرتے ہیں، تعمیرات کے سلسلہ میں انجینئر پر بھروسہ رکھتے ہیں، اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبے ہیں، یہ سب دنیوی مسائل میں تقلید ہی تو ہے، اسی طرح احادیث کی صحت وضعف کے سلسلہ میں امام بخاری و امام مسلم وغیرہ کی رائے پر اعتماد کرتے ہیں، رواۃ حدیث کے سلسلہ میں یحییٰ بن معین اور یحییٰ بن سعید القطان کی آراء کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں، قرأت قرآن میں حفص بن عاصم اور دوسرے مشہور قراء کی قراءت کو قبول کرتے ہیں، قرآن مجید کے رسم الخط کے سلسلہ میں رسم عثمانی کو معیار بناتے ہیں، مفردات قرآن وحدیث کے سلسلہ میں مشہور علماء لغت اور تراکیب وتعبیرات اور ان سے معنی اخذ کرنے میں ائمہ نحو وصرف پر ہمارا بھروسہ ہے، یہ سب تقلید ہی کی صورتیں ہیں اور ان صورتوں کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ دین وشریعت سے بھی ہے، اسی طرح احکام شریعت کے استنباط کے سلسلہ میں ہم کچھ فقہاء کی آراء پر اعتماد کرتے ہیں، اور ان کی تشریحات کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں، تمام صورتوں میں تقلید جائز ہو تو اس میں تقلید ناپسندیدہ وناروا کیوں ہوسکتی ہے؟

کسی بھی میدان میں تقلید و اعتماد کی ایک صورت یہ ہے کہ مختلف مسائل میں مختلف ماہرین کی رائیں لی جائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی ماہر فن کی آراء کو اپنے سامنے رکھا جائے، پہلی صورت مطلق تقلید کی ہے اور دوسری صورت تقلید شخصی کی، ان دونوں صورتوں کا مقصد چوں کہ کتاب وسنت ہی کی اتباع ہے؛ اس لئے یہ دونوں ہی صورتیں جائز ہیں؛ البتہ چوتھی صدی ہجری کے بعد عام طور پر امت نے دوسرے طریقۂ کار کو اختیار کیا؛ کیوں کہ اگر یہ پابندی نہیں رکھی جاتی تو بندگانِ ہوس کے لئے نفس پرستی اور اتباع ہوی کا راستہ کھل جاتا؛ چنانچہ بڑے بڑے محدثین اور اہل علم اپنے علم وفضل کے باوجود اسی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں؛ اسی لئے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ تقلید اس دور میں واجب لغیرہ ہے۔

ان فقہاء مجتہدین میں ائمہ اربعہ کو اس اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کہ ایک تو ان کے فتاوی میں قریب قریب تمام ہی صحابہ کے فتاوی جمع ہو گئے ہیں، دوسرے زندگی کے اکثر مسائل سے متعلق ان کے اجتہادات مرتب صورت میں موجود ہیں اور چوں کہ ان کا طریقۂ اجتہاد بھی مدون کر دیا گیا ہے؛ اس لئے جن مسائل کے بارے میں ان کی رائیں موجود نہیں تھیں، ان کو بھی متبعین مذہب نے ان اصولوں کی روشنی میں مستنبط فرمایا ہے؛ اس لئے گویا ایک پورا نظام حیات مرتب شکل میں موجود ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں اس طرح مرتب و محفوظ نہیں، پچاس، سو، دو سو مسائل میں ان کے فتاوی ملتے ہیں، اس طرح من جانب اللہ مذاہب اربعہ کو اساطین امت میں جو پذیرائی حاصل ہوئی، وہ دوسروں کو حاصل نہ ہو سکی، اگر کوئی شخص صحاح ستہ کے بارے میں دریافت کرے کہ ان کتابوں کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے، تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ ان کتابوں کے مصنفین کے اخلاص اور جد و جہد کا ثمرہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقبولیت ہے، بعینہ یہی بات مذاہب اربعہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن ضرورت بہر حال اعتدال کی ہے، اس وقت ایک گروہ وہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ از سر نو اجتہاد و استنباط کیا جائے اور فقہ کے پرانے ذخیرہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نئی بنیاد رکھی جائے، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے فقہاء کے اجتہادات کو شارع کی نصوص کا درجہ دے رکھا ہے، یہاں تک کہ احوالِ زمانہ کی وجہ سے اگر کسی خاص مسئلہ میں کسی اور فقہ کی طرف عدول کیا جائے تو ایسی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ گویا کتاب و سنت سے انحراف ہو رہا ہے، اس افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اور گزشتہ کئی صدیوں میں سب سے پہلے جس شخص نے مسائل فقہیہ میں اعتدال کی دعوت دی، وہ ہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ صاحب ایسی عبقری شخصیتوں میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، وہ مجتہدانہ شان کے حامل تھے، وہ ان لوگوں میں تھے جو بنے بنائے راستہ پر چلنے کی بجائے خود کہساروں کو تراش کر راستے بناتے ہیں، ان کی جودتِ فکر، وسعتِ نظر، مسلکی رواداری، مختلف مذاہب کے احترام، کتاب و سنت سے اعتناء، تقلید و اتباع میں اعتدال، اسرارِ شریعت پر گہری نظر

اور فکر ونظر میں میانہ روی اپنے زمانہ کے علماء سے بالکل مختلف تھی ، وہ جس ماحول میں پیدا ہوئے ، اس ماحول میں ایسی شخصیت کا جنم لینا ایک حیرت انگیز اور تعجب خیز بات معلوم ہوتی ہے، اور یہ ان کی غیر معمولی ذہانت واستقامت کی علامت ہے؛ کیوں کہ غیر معمولی انسان ہی اپنے ماحول کی قید سے آزاد رہ سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے فقہی مسائل میں اعتدال پر اور چوں کہ یہ اجتہاد و تقلید سے متعلق ہے؛اس لئے اجتہاد وتقلید کے موضوع پر اپنی مختلف کتابوں میں قلم اٹھایا ہے،شاہ صاحب کی شہرہ آفاق تالیف '' حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اس موضوع پر مستقل ایک باب موجود ہے اور اس پوری کتاب میں ان کی فکر اعتدال اس طرح رچی بسی ہوئی ہے، جیسے موتیا میں اس کی خوشبو؛ لیکن خاص کر تقلید واجتہاد کے موضوع پر آپ نے تفصیل سے اپنی تالیف ''عقد الجید'' میں قلم اٹھایا ہے، جیسے '' حجۃ اللہ البالغۃ'' ایک منفرد کتاب ہے، اسی طرح اپنے موضوع پر یہ رسالہ بھی بے مثال اور '' بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کا صحیح مصداق ہے۔

عام طور پر اہل علم نے اجتہاد کی قسمیں بیان کی ہیں ؛لیکن شاہ صاحب نے اپنی اس تالیف میں اجتہاد کے درجات کے ساتھ ساتھ تقلید کے درجات پر بھی روشنی ڈالی ہے، اجتہاد میں آزادی طبع کو بھی منع کیا ہے اور تقلید میں جمود وغلو کی بھی نفی کی ہے اور ایک ایسا نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو اعتدال اور میانہ روی پر مبنی ہے، عام اصولیین کے برخلاف شاہ صاحب نے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ اختلافی مسائل میں ایک کا مبنی برصواب اور دوسرے کا مبنی برخطا ہونا ضروری نہیں ؛ بلکہ دونوں رائیں صائب ودرست قرار دی جاسکتی ہیں، جیسا کہ ایک کوتاہی پر شریعت میں متعدد کفارات موجود ہیں اور ہر کفارہ اپنی جگہ مکمل اور کافی ہے،اس سے قطع نظر کہ شاہ صاحب کی یہ رائے کس حد تک قابل قبول ہے؟ آپ کی اس فکر سے فقہی اعتدال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جہاں اسرار شریعت سے آگہی کے لئے '' حجۃ اللہ'' کو ہر عالم دین کے سامنے ہونا چاہئے ، ویسے ہی آپ کی تالیفات '' الانصاف'' اور '' عقد الجید'' بھی ہر صاحب علم ،فقہاء، ارباب افتاء اور علوم اسلامی کے اساتذہ کے پیش نظر رہنی چاہئے ؛ تاکہ مذاہب فقہی کے بارے

میں ان کے اندر صحیح سوچ پیدا ہو، اور وہ افراط وتفریط سے محفوظ رہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ برصغیر میں اہل سنت کے تمام مکاتبِ فکر شاہ صاحب کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں؛ لیکن عملاً ان کی فکر اعتدال سے کوسوں دور ہیں؛ بلکہ اگر شاہ صاحب اس دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو جیسے ان کے معاصر کچھ تنگ نظر علماء نے ان کی مخالفت کی تھی، اسی طرح اس زمانے میں یہی لوگ ان کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے۔

''عقد الجید'' کی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، غالباً سب سے پہلے اس کا ترجمہ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی نے ''سِلک مروارید'' کے نام سے فرمایا، جو متن کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس حقیر کو بھی اس ترجمہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا ہے، گو اب اس کی زبان میں قدامت کا احساس ہوتا ہے؛ لیکن ترجمہ عمدہ ہے اور اس کے لئے مترجم کا اسم گرامی کافی ہے، ضرورت تھی کہ اس اہم کتاب کو جدید اور سلیس اردو زبان کا پیکر عطا کیا جائے اور خود اصل کتاب کے متن کی بھی تحقیق کی جائے؛ کیوں کہ مطبوعہ کتاب کی بعض عبارتوں کو پڑھنے میں کہیں کہیں خلا کا احساس ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بے حد جزائے خیر عطا فرمائے محبِ عزیز مولانا ڈاکٹر فہیم اختر ندوی زیدت حسناتہ کو، کہ انھوں نے کتاب کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر دقتِ نظر کے ساتھ اس کی تحقیق کی، آیات واحادیث اور محولہ دست یاب کتابوں سے عبارت کا مقارنہ کیا اور کتاب کا ایک محقق نسخہ تیار کیا، پھر اس کا ترجمہ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا، ترجمہ رواں آسان اور عام فہم ہے، عام طور پر قدیم کتابوں میں حوالہ دیئے ہوئے مصنف معروف کی نسبت کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، انھوں نے اس کے ساتھ قوسین میں شخصیتوں کے پورے نام مع سنین وفات ذکر کردئے ہیں اور رموز تحریر کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے، نیز ذیلی عنوانات لگا کر استفادہ کو آسان کردیا ہے، واقعہ ہے کہ یہ ایک اہم خدمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لی ہے اور نہ صرف علماء بلکہ دینی جماعتوں کے کارکنوں اور مختلف دبستانِ فکر کے قائدین کو بھی گہری نظر کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مولانا موصوف ماشاءاللہ صاحب توفیق عالم ہیں، انھوں نے کم عرصہ میں فقہ واصولِ

فقہ کے موضوع پر کئی اہم کام کئے ہیں، ان تصنیفات میں ان کا بلوغ نظر اور شعور وآ گہی پوری طرح نمایاں ہے اور ہر جگہ اعتدال کا رنگ موجود ہے، اس حقیر کا خیال ہے کہ ''عقد الجید'' کا یہ ترجمہ ان کی طرف سے تمام مذاہب کے احترام اور فکرِ ولی اللّٰہی کی طرف دعوت ہے، خدا کرے کہ اہل علم ان کی اس دعوت پر لبیک کہیں، وباللہ التوفیق وھو المستعان ۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
۳۰ مارچ ۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[ابتدائیہ]

ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کو تمام عرب اور عجم کے پاس بھیجا، تا کہ لوگ ان کی ذات سے تاریکیوں میں روشنی حاصل کریں، اور ان کے ذریعہ بلند ہمت لوگ اعلی مقامات تک رسائی پائیں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ تنہا ہے۔ اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، جن کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اللہ درود وسلام اور برکتیں نازل کرے آپ کی ذات پر، آپ کی آل پر اور آپ کے اصحاب پر۔

بندہ ناتواں، اپنے کریم رب کی رحمتوں کا خواہاں، ولی اللہ بن عبدالرحیم عرض کناں ہے۔ اللہ اسے ہر برائی سے حفظ وامان میں رکھے اور اس کے قلب و حال اور معاملات کو استوار فرمائے۔

اس رسالہ کا نام میں نے 'عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' رکھا ہے۔ اس کی تحریر کا باعث بعض رفقاء کے وہ سوالات تھے، جو اس موضوع کے اہم مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔

باب [اول]

اجتہاد کی حقیقت، اس کی شرائط اور اقسام

[اجتہاد کی تعریف]

اجتہاد کی حقیقت، جیسا کہ علماء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کی روشنی میں معلوم کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش صرف کردی جائے۔ یہ تفصیلی دلائل چار بنیادی مآخذ میں سمٹ آتے ہیں، جو یہ ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔

اجتہاد کی اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ جس مسئلہ کا شرعی حکم معلوم کرنے کی کوشش کی جائے وہ بالکل نیا مسئلہ ہو تب بھی یہ کوشش اجتہاد ہے، اور اس مسئلہ پر علماء سابقین نے گفتگو کر رکھی ہو تب بھی یہ کوشش اجتہاد کہلاتی ہے، اور اس وقت بھی یہ اجتہاد ہے جب کوشش کرنے والے کی رائے سابق علماء کی رائے سے علاحدہ بنی ہو، اور اس وقت بھی جب اس کی رائے پچھلی کسی رائے کے موافق ہوئی ہو۔ اجتہاد کا یہ عمل تن تنہا بھی ہوسکتا ہے، اور دوسروں کے تعاون کے ساتھ بھی، اس طور پر کہ یا تو مسائل کی صورتوں کی نشاندہی میں مدد لی جائے، یا شرعی دلائل کی جانب رہنمائی میں تعاون لیا جائے۔ مذکورہ ہر صورت کی کوشش اجتہاد ہے۔

لہذا جن علماء اور فقہاء نے اکثر و بیشتر مسائل میں اپنے شیخ اور استاذ کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن وہ بذات خود ہر حکم کی شرعی دلیل سے واقف تھے، اس دلیل پر انہیں انشراح اور اطمینان تھا، اور وہ اس پر پوری بصیرت رکھتے تھے، وہ سارے علماء اور فقہاء مجتہد تھے۔ ان کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ وہ مجتہد نہیں تھے۔ اور جب یہ غلط ہے تو پھر یہ بھی غلط ہے کہ ان زمانوں میں کوئی مجتہد موجود نہیں تھا۔

[اجتہاد کی شرائط]

اجتہاد کے لئے یہ شرط ہے کہ قرآن اور سنت کے ان حصوں سے واقفیت ہو جو احکام سے متعلق ہیں۔ ان مسائل کا علم ہو جن پر اجماع ہو چکا ہے۔ قیاس کی شرطوں سے آگاہی ہو۔ غور و خوض کا طریقہ معلوم ہو۔ عربی زبان و ادب کا علم ہو۔ ناسخ اور منسوخ معلوم ہوں۔ راویان حدیث کے حالات سے واقفیت ہو۔ البتہ علم کلام اور فقہ کی واقفیت ضروری نہیں ہے۔

امام غزالی [ابو حامد محمد بن محمد، ۴۵۰۔۵۰۵ھ] فرماتے ہیں: ''ہمارے زمانہ میں اجتہاد فقہ کے ساتھ اشتغال سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں فقہی مسائل سے تعلق کے ذریعہ ہی فہم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہ طریقہ نہیں تھا۔''(۱)

لیکن میں کہتا ہوں کہ امام غزالی کی یہ رائے اجتہاد مطلق منتسب کے بارے میں ہے، کیونکہ مجتہد مطلق منتسب کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجتہد مستقل کی آراء اور اقوال سے واقف ہو، اسی طرح مجتہد مستقل کے لئے ضروری ہے کہ فقہی مسائل میں صحابہ، تابعین اور ان کے متبعین کے اقوال اسے معلوم ہوں۔

اجتہاد کی جن شرائط کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا وہ اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ تحریر ہیں۔

اس موقع پر امام بغوی [حسین بن مسعود، ۴۳۶-۵۱۰ھ] کی رائے ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''مجتہد وہ شخص ہے جو پانچ علوم کا جامع ہو: اللہ کی کتاب کا علم۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم۔ علماء سلف کے اقوال کا علم کہ کن مسائل میں ان کا اجماع ہے، اور کن مسائل میں ان کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ عربی زبان کا علم اور قیاس کا علم۔ قیاس اس طریقہ کا نام ہے جس کے ذریعہ قرآن اور سنت سے کسی حکم کا استنباط اس وقت کیا جاتا ہے، جب اس مسئلہ کا حکم قرآن، سنت اور اجماع میں صاف طور پر موجود نہ ہو۔

---

(۱) المستصفی من علم الاصول ۲/ ۳۸۸، مؤسسۃ الرسالہ ۱۹۹۷ء

قرآن کے علم میں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ کون سی آیت ناسخ ہے، اور کون منسوخ ہے۔کون سا حکم مجمل ہے اور کہاں اس کی تفصیل آئی ہے۔کون سا حکم خاص ہے اور کون عام ہے۔محکم حکم کون ہے اور متشابہ کون۔ نیز مکروہ، حرام، مباح، مستحب اور واجب کے بارے میں معلوم ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے علم میں مذکورہ ان تمام باتوں کا علم ہو۔ساتھ ہی یہ معلوم ہو کہ کون حدیث صحیح ہے اور کون ضعیف۔مسند حدیث کون ہے اور مرسل حدیث کون۔ اسی طرح سنت کے ساتھ قرآن کے، اور قرآن کے ساتھ سنت کے مقام کی ترتیب معلوم ہو، تا کہ اگر کوئی ایسی حدیث سامنے آئے جو بظاہر قرآن کریم سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو وہ اس حدیث کے مصداق کو طے کرنے کی راہ پا سکے۔ کیونکہ سنت قرآن کریم کا بیان ہے، وہ قرآن کے مخالف نہیں ہوسکتی ہے۔سنت میں صرف ان احادیث سے واقفیت ضروری ہے جو شرعی احکام سے متعلق ہیں۔ جو احادیث قصوں، واقعات اور مواعظ ونصائح سے متعلق ہیں ان کا علم ضروری نہیں ہے۔

عربی زبان کے علم میں بھی ان چیزوں کا جاننا کافی ہے جو قرآن وحدیث کے احکام سے تعلق رکھتی ہیں۔تمام لغات عرب کا احاطہ مطلوب نہیں ہے۔عربی زبان وادب میں اتنی صلاحیت ہونی چاہئے کہ ان تمام جگہوں پر کلام کا مقصود سمجھ میں آسکے جہاں موقع ومحل کے فرق اور احوال کے اختلاف سے مفہوم بدل جاتے ہیں۔اس لئے کہ شریعت کے احکام عربوں کی زبان میں آئے ہیں، جو شخص عربوں کی زبان سے ناواقف ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد کو نہیں سمجھ سکے گا۔اسی طرح وہ احکام کے سلسلہ میں صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال اور فقہائے امت کے بیشتر فتاوی سے واقف ہو، تا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کا کوئی فیصلہ اور فتوی ان اقوال کے خلاف چلا جائے اور اس طرح خرق اجماع پیش آجائے۔

پس جو شخص ان تمام علوم میں سے ہر علم کے بیشتر حصہ سے واقف ہو جائے، وہ اس وقت مجتہد ہے۔ یہ شرط نہیں ہے کہ ان تمام علوم سے اس طرح واقفیت ہو کہ ان کا معمولی حصہ بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ ہو۔البتہ جو شخص ان علوم میں سے کسی ایک علم کو سرے سے نہ جانتا ہو تو پھر اس کے لئے تقلید کا راستہ ہے۔خواہ وہ ائمہ سلف کے

فقہی مسالک میں سے کسی ایک مسلک پر مکمل عبور رکھتا ہو۔ ایسے شخص کے لئے نہ تو منصب قضا پر فائز ہونا جائز ہے اور نہ فتوی دینے پر آمادہ ہونا جائز ہے۔

لہٰذا جو شخص ان مذکورہ تمام علوم کا جامع ہو، اور وہ خواہشات نفسانی اور بدعات سے دور ہو، تقوی و پرہیز گاری سے آراستہ ہو، کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور صغیرہ گناہوں کا عادی نہ ہو تو اس کے لئے درست ہے کہ وہ قضا کے منصب کو سنبھالے، شریعت کے مسائل میں اجتہاد کرے اور اپنے فتاوی دے۔

اور وہ لوگ جو ان تمام شرائط کے جامع نہ ہوں اپنے مسائل میں ایسے مجتہد کی تقلید کریں گے"۔(۱) علامہ بغوی کا اقتباس ختم ہوا۔

[اجتہاد کی قسمیں]

علامہ رافعی [ابو القاسم عبد الکریم بن محمد، ۵۵۷۔۶۲۳ھ]، علامہ نووی [ابوزکریا یحی بن شرف نووی، ۶۳۱۔۶۷۶ھ] اور دوسرے بے شمار علماء نے صاف صاف لکھا ہے کہ مجتہد مطلق کی، جس کا ابھی تعارف گزرا دو قسمیں ہیں: مجتہد مستقل اور مجتہد منتسب۔ ان علماء کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ مجتہد مستقل کے اندر تین خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں: اول یہ کہ وہ ایسے اصول خود بناتا ہے جن پر اس کے اجتہاد کی بنیاد ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جن مسائل کے بارے میں پہلے جوابات دئے جا چکے ہیں، ان میں بھی وہ قرآن کی آیات، احادیث اور آثار کو مکمل طور پر دیکھتا ہے۔ دلائل میں تعارض ہو تو ایک دلیل کو دوسری دلیل پر ترجیح دیتا ہے، کسی دلیل میں کئی معانی کا احتمال ہو تو راجح معنی کو متعین کرتا ہے اور ان تمام دلائل میں سے حکم کے ماخذ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے۔ حقیقت حال اللہ کو بہتر معلوم ہے۔ کہ امام شافعیؒ کے علم کا دو تہائی حصہ اسی قسم سے متعلق تھا۔ تیسرے یہ کہ جو نئے مسائل پیش آئے ہیں، جن کے بارے میں کوئی جواب پہلے نہیں دیا گیا ہے، دلائل کی روشنی میں ان کے جوابات متعین کرتا ہے۔

اور مجتہد منتسب وہ شخص ہے جو اپنے استاذ کے اصولوں کو تسلیم کرتا ہے اور دلائل کی

---

(۱) شرح السنہ ۱۰/۱۲۰۔۱۲۲، مکتب اسلامی بیروت، ۱۹۸۳

تلاش اور حکم کا ماخذ متعین کرنے میں اپنے استاذ سے بہت زیادہ استفادہ کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود تمام احکام کے دلائل پر وہ بذات خود اطمینان رکھتا ہے، اور ان کی روشنی میں مسائل مستنبط کرنے کی قدرت رکھتا ہے، خواہ ایسا کم پیش آیا ہو یا زیادہ۔

اوپر کی سطور میں اجتہاد کی جن شرائط کا ذکر کیا گیا ہے، وہ مجتہد مطلق سے متعلق ہیں۔ اس سے کم درجہ کا شخص 'مجتہد فی المذہب' ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جو اپنے امام کے فتاوی کی تقلید کرتا ہے؛ لیکن امام کے قواعد اور ان کے مذہب کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوتا ہے، اور جب کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس میں امام کا فتوی نہ ہو تو وہ اس واقعہ میں اپنے امام کے مذہب پر اجتہاد کرتا ہے اور امام کے اقوال اور منہج کے مطابق اس کا حکم بتاتا ہے۔ اس کے بعد کا درجہ 'مجتہد الفتوی' کا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنے امام کے مذہب کا ماہر ہوتا ہے اور اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک قول کو دوسرے قول پر اور علماء مذہب کی آراء میں سے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دے سکے۔

باب [دوم]

مجتہدین کے درمیان اختلاف

[ہر رائے درست ہے یا صرف ایک رائے]

اس بات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ شریعت کے وہ فروعی مسائل جن کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں ہے، ان میں کیا ہر مجتہد کی رائے درست ہے، یا صرف ایک ہی رائے درست ہے؟ شیخ ابوالحسن اشعری [علی بن اسماعیل، ۲۶۰-۳۲۴ھ]، قاضی ابوبکر [محمد بن الطیب باقلانی، ۳۳۸-۴۰۳ھ]، امام ابو یوسف [یعقوب بن ابراہیم، ۱۱۳-۱۸۲ھ]، امام محمد بن الحسن [شیبانی، ۱۳۱-۱۸۹ھ] اور ابن سریج [احمد بن عمر بن سریج، متوفی ۳۰۶ھ] پہلی رائے رکھتے ہیں، اوراشاعرہ اور معتزلہ میں سے جمہور متکلمین سے بھی یہی قول نقل کیا گیا ہے۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں اس رائے کی جانب ایسے اشارے ہیں جو تقریبا صریح ہیں۔ دوسری رائے جمہور فقہاء کی ہے کہ صرف ایک ہی مجتہد کی رائے درست ہے۔ چاروں ائمہ فقہ سے بھی یہی رائے نقل کی گئی ہے۔ ابن السمعانی [منصور بن محمد، ۴۲۶-۴۸۹ھ] نے القواطع میں لکھا ہے کہ یہی امام شافعی کا ظاہر مذہب ہے۔

[قاضی بیضاوی کی رائے]

قاضی بیضاوی [عبداللہ بن عمر ناصر الدین، متوفی ۶۸۵ھ] نے 'المنہاج' میں لکھا ہے:

"مجتہدین کی مختلف آراء میں سے ہر رائے کے درست ہونے میں اختلاف کی بنیاد دراصل یہ اختلاف ہے کہ کیا ہر صورت واقعہ کے لئے کوئی متعین حکم اللہ کی طرف سے

ہے جس پر قطعی یا ظنی دلیل موجود ہو؟ راجح رائے وہ ہے جو امام شافعی سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ ہر واقعہ میں ایک متعین حکم موجود ہے، اور اس حکم کی دلیل موجود ہے۔ جس مجتہد نے وہ دلیل پالی اس کی رائے درست ہوئی، اور جس مجتہد کی رسائی اس دلیل تک نہیں ہوسکی اس کی رائے غلط ہے؛ لیکن وہ گنہ گار نہیں ہے؛ اس لئے کہ اجتہاد دلائل کے بعد ہی آتا ہے؛ کیونکہ دلائل کی تلاش ہی کا نام اجتہاد ہے۔ اور دلالت حکم کے بعد آتی ہے۔ تو اگر ایک ہی مسئلہ میں دو اجتہاد وجود میں آئیں تو دو متضاد چیزیں جمع ہو جائیں گی۔ اور اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''من اصاب فله اجران ومن اخطا فله اجر واحد''(۱) [جو صحیح رائے تک پہنچ گیا اس کے لئے دوہرا اجر ہے، اور جو خطا کر گیا اس کے لئے ایک اجر ہے]

یہاں اس رائے پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی جانب سے ہر مسئلہ کا حکم متعین ہے، تو اس حکم کے خلاف فتوی دینے والا اللہ کے حکم کے خلاف فتوی دینے والا ہوگا۔ اور قرآن کریم میں ہے: ''ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الفاسقون''(۲) [اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں]؛ لہذا ایسا شخص تو فاسق قرار پائے گا۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے؛ کیونکہ جب آیت بالا میں اس بات کا حکم ہے کہ جس چیز کو وہ اللہ کا حکم خیال کرے اس کے مطابق فیصلہ دے تو خواہ اس سے خطا ہو جائے، اس نے اللہ کے نازل کردہ حکم پر فیصلہ کیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر اختلافی مسئلہ میں تمام مجتہدین کی رایوں کو درست نہ تسلیم کیا جائے تو مخالف رائے والے شخص کو کوئی شرعی ذمہ داری سونپنا غلط قرار پائے گا؛ حالانکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ذمہ داری سونپی۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ باطل رائے والے کو ذمہ داری سونپنا ناجائز ہے، اور خطا کرنے والا شخص باطل رائے رکھنے والا نہیں ہوتا ہے۔''(۳) تاہی بیضاوی کی بات ختم ہوئی۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

(۱) سورہ مائدہ، آیت ۴۷۔

(۲) شرح البیضاوی فی علم الاصول، ۲/۷۸۳، مکتبہ الرشد، ریاض ۱۹۹۹ء۔

[بیضاوی کی رائے پر تبصرہ]

قاضی بیضاوی نے جو فرمایا کہ "ہر صورت مسئلہ کے لئے اللہ کی جانب سے حکم متعین ہوتا ہے"۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ تو غیب پر بے دلیل حکم لگانا ہے۔ اور قاضی بیضاوی نے یہ فرمایا کہ "امام شافعی سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ ہر واقعہ میں ایک متعین حکم موجود ہے"۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر واقعہ میں ایک قول ایسا ہوتا ہے جو اصول سے زیادہ ہم آہنگ اور اجتہاد کے طریقوں سے زیادہ مطابق ہوتا ہے۔ اس قول پر اجتہاد کے دلائل میں سے کوئی واضح علامت ہوتی ہے۔ یہ علامت جس نے پالی، اس کی رائے درست ہو جاتی ہے اور جسے یہ علامت نہیں مل سکی وہ خطا کر جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ گنہ گار نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ امام شافعی نے 'الام' کے شروع میں لکھا ہے کہ جب ایک عالم دوسرے عالم سے کہتا ہے کہ: "تم نے خطا کی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اس درست راہ سے خطا کر گئے جس پر علماء کو چلنا چاہئے تھا۔ امام شافعی نے اس مطلب کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اسے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ میں حدیث (خبر واحد) موجود ہے تو جس کو وہ حدیث مل گئی وہ صحیح راستہ پر پہنچ گیا اور جسے وہ حدیث نہ مل سکی اس سے خطا ہوئی۔ اس مسئلہ پر بھی 'الام' میں بڑی تفصیل موجود ہے۔ قاضی بیضاوی کا جملہ ہے "اس لئے کہ اجتہاد دلائل کے بعد آتا ہے"، اس پر ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالی کی عبادت یوں کی کہ ہم اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کریں گے۔ پس جس چیز پر ہم اجمالاً عمل کر رہے ہیں اس کی تلاش و جستجو کریں تاکہ تفصیل کے ساتھ اس کا احاطہ کر سکیں۔ بیضاوی کا ایک جملہ ہے: "دو متضاد چیزیں جمع ہو جائیں گی"۔ اس پر عرض ہے کہ یہ ٹھیک اس طرح ہے جیسے کفارہ کے لئے کئی چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر چیز واجب بھی ہوتی ہے اور واجب نہیں بھی ہوتی ہے۔ قاضی بیضاوی نے فرمایا ہے: "جو صحیح رائے تک پہنچ گیا اس کے لئے دوہرا اجر ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو ہمارے حق میں اور آپ کے خلاف جارہی ہے، اس لئے کہ جس خطا پر اجر عطا کیا جائے وہ معصیت اور گناہ نہیں ہو سکتی۔ لہذا لازم ہوگا کہ وہ دونوں اللہ کا حکم ہوں، جن میں ایک حکم دوسرے حکم سے افضل ہے، جس طرح عزیمت اور رخصت کے دو حکم ہوتے ہیں۔ یا اس کا تعلق قضا سے ہے کیونکہ ظاہر میں یا تو مدعی کا

دعوی ثابت ہوگا، یا مدعا علیہ کی بات تسلیم کی جائے گی۔ قاضی بیضاوی نے کہا کہ ''جس چیز کو وہ اللہ کا حکم خیال کرے اس کے مطابق فیصلہ دے''، تو یہ تو ہمارے مقصود کا اعتراف ہے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''خطا کرنے والا شخص باطل رائے والا نہیں ہوتا ہے''، تو جب خطا کرنے والا شخص باطل رائے والا نہیں رہا تو وہ حق کا مخالف بھی نہیں رہا، اس لئے کہ جو حق کا مخالف ہوگا وہ باطل والا ہوگا۔ حق سے ہٹ کر گمراہی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

[صحیح بات]

حق بات یہ ہے کہ چاروں اماموں کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے، [کہ اختلافی مسئلہ میں صرف ایک رائے درست ہے اور بقیہ غلط، یہ بات ان اماموں نے خود نہیں فرمائی ہے] اور ان سے ایسی صراحت ثابت نہیں ہے، ان کی بعض آراء اور اقوال سے یہ مفہوم دوسروں نے نکالا ہے۔ اور اس بات میں امت کا کوئی اختلاف نہیں کہ ایسے مسائل میں تمام مجتہدین کی آراء درست ہیں، جن میں نص کے ذریعہ یا اجماع کے ذریعہ اختیار دیا گیا ہے، جیسے قرآن کی قراءت وتلاوت کے سات طریقے، دعاؤں کے مختلف جملے، نماز وتر کی سات یا نو یا گیارہ رکعتیں۔ تو اسی طرح جن مسائل میں استدلال اور دلالت کے ذریعہ اختیار دیا گیا ہے، ان میں بھی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔

[اختلاف کی قسمیں]

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی چار قسمیں ہیں:

اول: وہ اختلاف جس میں حق قطعی طور پر متعین ہے، اور لازم ہے کہ اس کی مخالف رائے کو رد کر دیا جائے؛ اس لئے کہ وہ یقینی طور پر باطل ہے۔

دوم: جس میں حق کا تعین غالب گمان کے ذریعہ ہوا ہے، اور مخالف رائے ظنی طور پر باطل ہے۔

سوم: وہ اختلاف جس میں یقینی طور پر دونوں مخالف رایوں میں اختیار حاصل ہے۔

چہارم: وہ اختلاف جس میں ظنی طور پر ہر رائے کے بارے میں اختیار حاصل ہے۔

اس تقسیم کی تفصیل یہ ہے کہ اگر درپیش مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن میں قاضی کا فیصلہ بھی رد کر دیا جاتا ہے، مثلاً اس مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کی صحیح اور معروف نص موجود ہے، تو ہر اجتہاد جو حدیث کے خلاف ہو، باطل ہے۔ ہاں جس مجتہد کو رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث معلوم نہ ہو سکے اسے معذور سمجھا جائے گا، تاآنکہ وہ حدیث اس تک پہنچ جائے اور حجت قائم ہو جائے۔ اور اگر اجتہاد کسی ایسے واقعہ کو معلوم کرنے کے سلسلے میں ہے جو واقعہ پیش آیا پھر اس کی صورت حال مشتبہ ہو گئی۔ مثال کے طور پر یہ معلوم کرنا ہے کہ زید زندہ ہے یا مر چکا ہے، تو بلا شبہ اس مسئلہ میں حق کوئی ایک ہے۔ البتہ اپنے اجتہاد کے باوجود خطا کرنے والا معذور قرار پائے گا۔ اور اگر اجتہاد ایسے مسئلہ میں ہے جسے مجتہد ہی کے اندازہ اور صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس میں دونوں پہلو بالکل قریب قریب ہیں، اور کوئی ایک پہلو بھی اتنا بعید نہیں ہے کہ اسے اختیار کرنے والے کے بارے میں واضح ہو جائے کہ اس نے کوتاہی کی ہے اور لوگوں کے عرف و رواج سے دور چلا گیا ہے، تو ایسے مسئلہ میں دونوں مجتہدین اپنی اپنی رائے میں درست قرار پائیں گے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ دو آدمی ہیں، ہر دو سے کہا گیا کہ تم دونوں کو جو بھی فقیر ملے اسے میرے مال میں سے ایک ایک درہم دے دو۔ انھوں نے پوچھا: ہم کیسے معلوم کریں کہ کون شخص فقیر ہے؟ تو ان سے کہا گیا: فقیر کی علامتوں کو غور سے دیکھو، جب تمہیں کسی کے بارے میں قلبی اطمینان ہو جائے کہ یہ فقیر ہے تو اسے درہم دے دو۔ اب ان دونوں کے درمیان ایک شخص کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ ایک آدمی نے کہا کہ یہ فقیر ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا کہ یہ فقیر نہیں ہے۔ اور اس شخص کے اندر دونوں طرح کی علامتیں بہت قریب قریب ہیں، اور دونوں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ تو ایسی صورت میں دونوں آدمیوں کے فیصلے صحیح سمجھے جائیں گے؛ اس لئے کہ ہر ایک آدمی نے اپنے فیصلہ کی بنیاد اپنے اس اندازہ اور صوابدید پر رکھی ہے کہ وہ فقیر ہے یا نہیں ہے، اور اس کے اندازہ اور کوشش میں بظاہر کوئی کوتاہی بھی نہیں پائی گئی ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی آدمی نے ایک ایسے بڑے تاجر کو درہم دے دیا جس کے ساتھ خدمت گار اور ٹھاٹ باٹ ہیں، تو اس کو فقیر سمجھنے والا آدمی کوتاہ قرار دیا جائے گا، اور اسے جو شبہات ہوئے ہوں ان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس مثال میں دو چیزیں دیکھنے کی ہیں: اول یہ کہ وہ فی الواقع فقیر ہے یا نہیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس امر میں حق صرف ایک ہے، اور اس میں دو متضاد چیزیں

جمع نہیں ہوسکتی ہیں ۔ دوسری دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس آدمی نے کسی غیر فقیر کو فقیر سمجھ کر درہم دے دیا، وہ آدمی اطاعت کرنے والا کہلائے گا یا نہیں؟ بلاشبہ وہ آدمی اطاعت گزار اور حکم ماننے والا کہلائے گا۔ ہاں جس آدمی کا اندازہ حقیقت کے مطابق نکلا اسے بڑا نصیب ملا۔

اور اگر اجتہاد کسی ایسے طریقہ کو اختیار کرنے میں ہو جس میں شریعت نے اختیار دے رکھا ہے جیسے قرآن کے حروف، دعاؤں کے جملے اور اسی طرح وہ اعمال جنھیں لوگوں کی آسانی کی خاطر رسول اللہ ﷺ نے کئی طرح سے انجام دئے ہیں، اور وہ سارے طریقے اصل مصلحت اور مقصود کے مطابق ہیں تو ان امور میں ہر دو مجتہد کی رائے درست ہے۔ یہ تمام وہ تفصیلات ہیں جو بالکل واضح اور صاف ہیں، ان میں کسی کو توقف نہیں ہونا چاہئے۔

[فقہاء کے درمیان اختلاف کے مواقع]

فقہاء کے درمیان اختلاف کے مواقع اور ایسے بیشتر امور چند قسم کے ہیں:

اول: یہ کہ ایک فقیہ تک حدیث پہنچی، لیکن دوسرے فقیہ کو وہ حدیث نہیں پہنچی۔ اس صورت میں ایک فقیہ کی رائے کا درست ہونا متعین ہے۔

دوم: یہ کہ ہر فقیہ کے پاس ایسی احادیث اور روایات ہیں جو باہم متعارض ہیں۔ ان میں ہر فقیہ نے اپنے اجتہاد کے ذریعہ ان احادیث میں باہم تطبیق دی یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دی، اور اجتہاد کے نتیجہ میں الگ الگ رائے قرار پائی، اور یوں اختلاف ہوا۔

سوم: یہ کہ فقہاء کے درمیان اس بات میں اختلاف ہوا کہ قرآن وحدیث میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ ان کی جامع اور مانع تعریف کیا ہے؟ کسی چیز کے ارکان اور شرائط کیا ہیں، جو تمام متعلق اوصاف پر غور وخوض اور حکم کی علت معلوم کرنے سے تعلق رکھتے ہیں؟ جو وصف عمومی حیثیت میں بیان ہوا ہے وہ ایک مخصوص صورت پر صادق آتا ہے یا نہیں؟ یا کوئی کلیہ اپنی جزئیات پر کس حد تک منطبق ہو رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور ان امور میں اختلاف کی وجہ سے ہر فقیہ کا اجتہاد علاحدہ نتیجہ تک پہنچا۔

چہارم: یہ کہ اصولی مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا، اور اس بنیاد پر فروعی مسائل میں رائیں مختلف ہوئیں۔

ان اقسام کے اختلاف میں ہر دو مجتہد کی رائے درست ہوگی؛ جب کہ دونوں کے دلائل اس انداز پر قریب قریب ہوں جیسا اوپر ذکر کیا گیا۔

[اصول فقہ کی حقیقت]

حقیقت یہ ہے کہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں: ایک قسم عربوں کے کلام اور زبان سے متعلق ہے، جیسے خاص اور عام، نص اور ظاہر۔ اس قسم کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی لغت کا ماہر کہے: یہ اسم نکرہ ہے، وہ معرفہ ہے، یہ علم ہے اور وہ اسم جنس ہے۔ فاعل مرفوع ہوتا ہے (یعنی اس پر پیش آتا ہے) اور مفعول پر زبر آتا ہے۔ اس قسم کی بحث میں بہت زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ دوسری قسم کے مسائل کا تعلق اس بات سے ہے کہ ذہن کو ان حقائق سے قریب کیا جائے جنھیں ایک عاقل شخص اپنے طبعی سلیقہ کے تحت انجام دیتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کسی عاقل شخص کو ایک ایسی بوسیدہ کتاب دی جائے جس کے کچھ حروف مٹ رہے ہوں، اور اس سے کہا جائے کہ وہ اس کتاب کو پڑھے۔ تو کتاب پڑھنے کے دوران جن مقامات پر اسے اشتباہ ہوگا وہ لازماً وہاں قرائن تلاش کرے گا اور صحیح الفاظ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اور بعض ایسے مقامات پر دو عاقل اشخاص کی رائیں مختلف بھی ہو جائیں گی۔ اور اگر اس عاقل شخص کے سامنے دو طریقے ہوں گے تو وہ ہر طرح دلائل پر غور وخوض کرے گا، مصالح کی چھان پھٹک کرے گا اور ایسے طریقہ کو اختیار کرنا چاہے گا جو راجح ہو اور جس میں نقصان کمتر ہو۔

ٹھیک اسی طرح جب علماء سلف کے سامنے مختلف احادیث آئیں اور انھوں نے ان پر بھرپور غور کیا، تو ان کے نتیجہ میں کوئی حدیث منسوخ ٹھہری۔ کہیں دو حدیثوں کے درمیان تطبیق دی گئی۔ کبھی ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح حاصل ہوئی۔ اسی طرح جب ان کے سامنے ایسے مسائل آئے جن پر ان سے پہلے اسلاف نے گفتگو نہیں کی تھی تو انھوں نے ایک نظیر کو دوسری

نظیر پر قیاس کیا اور علت مستنبط کئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ مناہج انھوں نے اپنے فطری تقاضے اور طبعی سلیقے کے مطابق اپنائے، جس طرح ایک عاقل کسی درپیش مسئلہ میں فطری طور پر اقدام کرتا ہے۔ پھر دوسروں نے ان مناہج کو مرتب کرنے کی کوشش کی جنھیں علمائے سلف نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تھا، یا دوران گفتگو ان کی جانب اشارے کئے تھے، یا انھوں نے ذکر تو نہیں کئے تھے، لیکن ان کے بیان کردہ مسائل سے مستنبط ہوتے تھے۔ پھر بعد کے فقہاء نے ان کے اکثر مناہج کو اصول کے طور پر اختیار کرلیا؛ کیوں کہ ایسے مسائل میں ان کے اندر بھی یہی طبعی تقاضے موجود تھے۔ پھر یہ مناہج فقہاء کے درمیان مسلمہ اصول کی حیثیت اختیار کر گئے۔

فن حدیث کے میدان میں بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ علماءِ سلف نے حدیث کی روایت، صحیح اور غیر صحیح حدیث اور مشہور اور غریب حدیث کے درمیان فرق وتعیین، راویان حدیث کی جرح وتعدیل، کتب حدیث کی تدوین اور ان کی درجہ بندی کی تو انھوں نے اپنے عقلی اور طبعی سلیقے کے مطابق اس میدان میں جرأت مندانہ قدم رکھا۔ پھر جب ان کے بعد دوسرے علماء آئے تو انھوں نے ان مناہج کو اصول وکلیات کی شکل دے کر مدون کیا۔

یہاں ایک مفید پہلو کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ان جیسے اصول اور کلیات پر عمل کرنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ زیر بحث جزئی مسئلہ ان مسائل میں سے نہ ہو جن میں سابق اہل عقل و دانش نے کلیات کے خلاف حکم دے رکھا ہو؛ اس لئے کہ بسا اوقات کسی مسئلہ میں ایسے خصوصی قرائن موجود ہوتے ہیں جو کلیات کے برعکس حکم ثابت کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر موضوع بحث یہ ہو جاتا ہے کہ کلیات کے تقاضا پر عمل کیا جائے، یا وہ حکم ثابت کیا جائے جو اس مخصوص مسئلہ میں بصراحت عقل طے پا چکا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ آپ کے سامنے ایک پتھر ہے، اور آپ کو یقین ہے کہ وہ پتھر ہے۔ پھر ایک فلسفی شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر چیز اپنے رنگ اور شکل وغیرہ سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ جو چیز رکھی ہے اس میں مذکورہ اوصاف مشتبہ ہو گئے ہیں۔ اس کلی اصول کے ذریعہ وہ آپ کے یقین کو توڑتا ہے۔ یہاں اس بے چارے کو یہ نہیں معلوم کہ اس خاص صورت میں جو یقین آپ کو حاصل ہے وہ کلیات کے تقاضوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ پس یہاں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ اصولی اقوال اور کلیات کی وجہ سے صریح حدیث رسول اور سنت سے روگردانی ہرگز نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے مسائل میں

اختلاف دراصل اندازہ اور قلبی اطمینان سے تعلق رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصول فقہ کے بیشتر اختلاف اسی اندازہ وتحری، اور قرائن کی روشنی میں قلبی اطمینان حاصل کرنے سے متعلق ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے متعدد مواقع پر اس بات کی جانب اشارہ فرمایا کہ شریعت کا حکم انسان کے اپنے اندازہ اور صوابدید پر مبنی ہے۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: "فطرکم یوم تفطرون و أضحاکم یوم تضحون "[1] [تمہاری عید الفطر اس دن ہے جس دن تم سب عید مناؤ، اور تمہاری قربانی کا دن وہ ہے جس دن تم سب قربانی کرو]

امام خطابی [ابوسلیمان حمد بن محمد، ۳۱۹۔۳۸۸ھ] فرماتے ہیں:

"اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے جو امور و مسائل غور اور اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں ان میں غلطی پر گرفت نہیں رکھی گئی ہے۔ لہذا اگر کسی جگہ کے لوگوں نے اپنی وسعت بھر کوشش کی، لیکن انھیں عید الفطر کا چاند نظر نہیں آیا، تو انھوں نے گنتی سے تیس دن پورے کئے پھر عید منائی۔ پھر یہ ثابت ہوا کہ رمضان کا مہینہ انتیس دنوں کا تھا۔ تو ایسی صورت میں ان لوگوں کے روزے اور ان کی عید درست ہوگی اور ان پر کوئی گناہ یا ملامت نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر حج کے اندر لوگوں کو عرفہ کا دن مقرر کرنے میں غلطی ہو جائے تو ان پر عرفہ کا وقوف دوبارہ کرنے کا حکم نہیں ہے، اور ان کی قربانی درست ہو جائے گی۔ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے تخفیف اور بندوں پر آسانی ہے"[2]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: "الحاکم اذا اجتهد فأصاب فله أجران واذا اجتهد فأخطأ فله أجر "[3] [حاکم جب اجتہاد وکوشش کرے اور صحیح نتیجہ تک پہنچے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے، اور اگر غلطی کر جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔]

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الصیام، باب اذا اخطأ قوم الھلال۔
(۲) معالم السنن، ۲/۸۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۱ء
(۳) صحیح مسلم، کتاب الاقضیہ

[روز مرہ مسائل میں تنگی نہیں]

جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کے جوابات پر مکمل نظر ڈالے گا، اس کے سامنے ایک قاعدہ کلیہ نکل کر آئے گا۔ وہ یہ کہ وضو، غسل، نماز، زکاۃ، روزہ اور حج وغیرہ جتنے نیکی کے اعمال ہیں جو تمام اقوام میں متعین طور پر رائج رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے انھیں مختلف انداز سے منضبط فرمایا۔ چنانچہ ان کے ارکان، شرائط اور آداب مقرر فرمائے۔ ان میں کیا چیزیں مکروہ ہیں؟ کن باتوں سے وہ فاسد ہو جاتے ہیں؟ اور کیا امور جائز ہیں؟ یہ سب بتائے۔ اور یہ ساری باتیں بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ذکر فرمائیں۔ لیکن خود ان ارکان اور شرائط وغیرہ کی جامع اور مانع تعریف طے کرنے پر زیادہ گفتگو نہیں فرمائی۔ بلکہ جب بھی آپ ﷺ سے ایسے جزوی سوالات کئے گئے جو ان ارکان اور شرائط وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے تو آپ ﷺ نے ایسے الفاظ میں جواب دے کر' جو الفاظ ان کے درمیان استعمال ہوتے تھے' ان امور کو ان کی ذاتی سمجھ پر چھوڑ دیا۔ اور انھیں جزئیات کو کلیات کی طرف پھیرنے کی جانب رہنمائی فرمائی۔ اس سے زیادہ تفصیل نہیں فرمائی۔ سوائے ان چند مسائل کے جن میں لوگوں کی حجت و بحث وغیرہ کے عارضی اسباب کے تحت آپ ﷺ نے تفصیل فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وضو میں چار اعضاء کو دھونے کا حکم بیان فرمایا، لیکن دھونے کی کیفیت کی کوئی جامع اور مانع تعریف نہیں فرمائی، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اعضاء کو ملنا بھی دھونے کی حقیقت میں داخل ہے یا نہیں؟ اور پانی کا بہنا دھونے کی حقیقت میں داخل ہے یا نہیں؟ نہ ہی آپ ﷺ نے مطلق پانی اور مقید پانی کی تقسیم فرمائی۔ نہ آپ ﷺ نے کنواں اور تالاب وغیرہ کے احکام بیان فرمائے؛ جب کہ یہ وہ مسائل تھے جو کثرت سے پیش آیا کرتے ہیں، اور یہ تصور ممکن نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہ مسائل پیش نہ آئے ہوں۔ اور جب بضاعہ کنواں کے قصہ میں[1]، اور دو قلے پانی والی حدیث کے قصہ میں[2] آپ ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اس سے زیادہ جواب نہیں دیا

---

(۱) حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بضاعہ کنویں سے وضو کریں، اور یہ وہ کنواں ہے جس میں عورتوں کی ناپاکی، کتے کے گوشت اور گندگیاں ڈالی جاتی ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: پانی پاک ہے، اسے کوئی شی ناپاک نہیں کرتی ہے۔ ابوداؤد، کتاب الطہارۃ۔

(۲) ابوداؤد میں حضرت عبید اللہ بن عمر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جہاں چوپائے اور درندے آتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب پانی دو قلے ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ ابوداؤد، کتاب الطہارۃ۔

جسے عام بول چال میں وہ سمجھتے تھے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے حضرت سفیان ثوریؒ جیسے محدث نے فرمایا: پانی کے مسئلہ میں ہمیں وسعت اور گنجائش ہی ملی۔ ایک خاتون نے کپڑے میں حیض کا خون لگ جانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، تو آپ ﷺ کا جواب صرف یہ تھا: "حتیہ ثم اقرصیہ ثم انضحیہ ثم صلی فیہ"(۱) [اس کو کھرچ دو، پھر رگڑ کر جھاڑ دو، پھر دھو ڈالو، پھر اس کپڑے میں نماز پڑھو۔] دیکھئے، آپ ﷺ کا جواب اس سے زیادہ نہیں ہے جسے وہ اپنے بول چال میں سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں قبلہ کی جانب رخ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ نہیں سکھایا۔ جب کہ صحابہ کرامؓ سفر کرتے تھے، اور دوران سفر انھیں قبلہ معلوم کرنے کے لئے کوشش کرنی پڑتی تھی۔ انھیں سخت ترین ضرورت تھی کہ قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ جان سکیں۔ یہ چیزیں ایسی تھیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے خود ان کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ آپ ﷺ کے بیشتر فتاوی اسی نوعیت کے ہیں، اور یہ بات کسی بھی منصف اور واقف شخص سے پوشیدہ نہیں ہے۔

[لوگوں کی سمجھ کی رعایت]

رسول اللہ ﷺ کے احکام کا جائزہ لینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ ﷺ نے مسائل میں بہت زیادہ چھان بین نہیں فرمائی، اور نہ ہر چیز کو ہر طرح سے منضبط و متعین کرنے پر بہت زیادہ توجہ دی۔ ان باتوں سے ایک عظیم مصلحت مقصود تھی۔ وہ یہ کہ ان مسائل کا تعلق ایسے حقائق سے ہے جو اپنے اجمال کے ساتھ عرف میں مستعمل ہیں۔ ان کی بالکل جامع اور مانع تعریف بہ آسانی نہیں جانی جاسکتی ہے۔ اور ان کی تعریف متعین کرتے وقت اس بات کی ضرورت ہوگی کہ جو دو چیزیں باہم متشابہ ہو رہی ہیں ان کے درمیان فرق اور امتیاز کرنے کے لئے احکام اور ضوابط طے کئے جائیں، جب کہ ان کو طے کرنے سے پریشانی پیش آئے گی۔ پھر اگر وہ منضبط کر دئے جائیں اور ان کی تشریح و توضیح کی جائے تو ان کی تشریح بھی دوسرے ایسے حقائق سے کی جائے گی جو پہلے حقائق کے مثل ہوں گے۔ تو یہ تسلسل اسی طرح چلتا چلا جائے گا۔ یا پھر کسی جگہ انھیں متعلقہ افراد کی صوابدید اور سمجھ پر ہی چھوڑنا پڑے گا۔ اور جب اشخاص کی

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الطہارۃ

صوابدید پر چھوڑنے کی بات آئے گی تو اس میں دوسرے حقائق پہلے حقائق سے کیوں کر زیادہ اہمیت رکھ سکیں گے۔ اسی مصلحت کی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے پہلے ہی ان حقائق کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اور ایسے مسئلہ میں اگر لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا تو آپ ﷺ نے اس میں سختی نہیں فرمائی، کیونکہ وہ معاملہ لوگوں کی صوابدید پر چھوڑا گیا تھا اور اس میں بھی اختلاف کی گنجائش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے قرآن کی آیت: ''ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة''(۱) [اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو] سے یہ مطلب سمجھا کہ جنبی شخص کو اگر ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے میں جان کا خطرہ محسوس ہو تو اس کے لئے تیمّم کرنا جائز ہے، تو رسول کریم ﷺ نے ان کی ملامت نہیں فرمائی۔ اور جب حضرت عمر بن خطابؓ نے: ''او لامستم النساء''(۲) [یا تم عورتوں سے ملے ہو] کا مطلب یہ سمجھا کہ یہ حکم عورت کو چھونے سے متعلق ہے، جنابت سے متعلق نہیں ہے، اور اس آیت میں جنبی شخص کا حکم مذکور نہیں ہے؛ لہٰذا جنبی شخص کو سرے سے تیمّم ہی نہ کرنا چاہئے۔ تو آپ ﷺ نے ان کی بھی تنبیہ نہیں فرمائی۔

نسائی شریف میں حضرت طارق سے روایت ہے کہ: ''ایک شخص کو جنابت پیش آ گئی تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ماجرا سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے صحیح کیا۔ پھر ایک اور شخص کو جنابت کی حالت پیش آئی، اس نے تیمّم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر خدمت نبوی میں واقعہ بیان کیا تو رسول کریم ﷺ نے اس سے بھی پہلے ہی جیسی بات فرمائی کہ تم نے صحیح کیا''(۳)

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ: ''عصر کی نماز بنو قریظہ میں ہی پڑھو''(۴)۔ اور آپ ﷺ کے اس حکم کی تاویل کرتے ہوئے کچھ نے عصر کی نماز مؤخر کر کے پڑھی اور کچھ دوسروں نے وقت پر عصر پڑھی تو آپ ﷺ نے کسی پر نکیر نہیں فرمائی۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بھی نبی کریم ﷺ کے کلام پر ہمہ پہلو نظر رکھے گا، اس کے

---

(۱) سورہ بقرہ، آیت ۱۹۵

(۲) سورہ مائدہ، آیت ٦

(۳) نسائی، باب من لم یجد الماء ولا الصعید

(۴) بخاری، کتاب الجمع

سامنے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو حقائق اپنے اجمال کے ساتھ عرف میں مستعمل ہیں، ان میں اور ان کو ایک دوسرے سے تطبیق دینے میں رسول اللہ ﷺ نے معاملہ کو لوگوں کی سمجھ اور صوابدید پر چھوڑا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فقہاء نے بہت سے احکام کو مبتلائے واقعہ شخص کی صوابدید اور اس کے اندازہ و عادت پر چھوڑا ہے۔ ایسے مسائل میں اگر دو اشخاص کے درمیان اختلاف ہو تو ان دونوں میں کوئی بھی فقہاء کے نزدیک قابل ملامت نہیں ہے۔ اسی کی مثال یہ بھی ہے کہ پوری امت کا یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ اگر آسمان ابر آلود ہونے کے وقت قبلہ کا رخ معلوم کرنے کے لئے تحری کی جائے، تو جس شخص کا اندازہ اور تحری جس رخ پر قبلہ طے کرے اس پر نکیر نہیں کی جائے گی۔ اس مصلحت کی ایک مثال یہ ہے کہ اہل مناظرہ کے درمیان اس بات پر باہم اتفاق ہوتا ہے کہ دلائل کے مقدمات پر بحث نہیں ہوگی تاکہ گفتگو منتشر نہ ہو جائے۔

[اختلاف کے دونوں پہلو برحق]

پس جو شخص اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ لے اسے معلوم ہو جائے گا کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں کے اندر اختلاف کے دونوں پہلوؤں میں حق دائر ہوتا ہے، اور ان میں گنجائش ہوتی ہے۔ ان مسائل میں کسی ایک پہلو پر جم جانا اور مخالف پہلو کی نفی پر یقین کرنا بے وزن بات ہے۔ اور ان حقائق کی تعریفات کو متعین کرنا اگر اس لئے ہے کہ اہل زبان کسی لفظ سے جو کچھ سمجھتے ہیں، اس کو ذہنوں سے قریب کیا جائے تو یہ علم کی خدمت ہوگی۔ لیکن اگر وہ ذہنوں سے دور ہے اور مشکل صورت کی توضیح خودساختہ مقدمات کے ذریعہ کی جائے تو بسا اوقات وہ ایک نئی شریعت ہو جائے گی۔

[امام عزالدین کی رائے]

امام عزالدین بن عبدالسلام [ابوالقاسم عبدالعزیز بن عبدالسلام، ۵۷۷-۶۶۰ھ] کی یہ بات سب سے درست ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اس چیز پر عمل کیا جو تمام علماء کے نزدیک واجب ہے، اس چیز سے باز رہا جس کے حرام ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے، اس چیز کو مباح سمجھا جس کے مباح ہونے پر تمام علماء متفق ہیں اور اس چیز سے علاحدہ رہا جو تمام علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔ اور جس چیز میں علماء کا اختلاف ہے، اس کو اختیار کرنے

والا دو حال سے خالی نہیں ۔ یا تو وہ ایسا مسئلہ ہوگا جس میں حاکم کا فیصلہ بھی رد کر دیا جاتا ہے تو اس مسئلہ میں تقلید کی گنجائش نہیں ہے؛ اس لئے کہ وہ واضح غلط ہے۔ اس میں فیصلہ اسی لئے رد کیا جاتا ہے کہ وہ غلط ہے اور شریعت کی دلیل اور اس کے ارشاد سے دور ہے۔ یا وہ ایسا مسئلہ ہوگا جس میں قاضی کا فیصلہ نہیں رد ہوتا ہے، تو ایسے مسئلہ میں اگر وہ کسی عالم کی تقلید کرتے ہوئے اس پر عمل کرے یا اسے ترک کرے تو دونوں صورتیں درست ہیں؛ اس لئے کہ ہمیشہ ایسے مسائل میں لوگ جس عالم سے میسر آیا پوچھتے رہے ہیں ۔ نہ تو کسی مسلک کی پابندی رہی ہے اور نہ کسی پوچھنے والے کو غلط سمجھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ فقہی مسالک اور ان کے متعصب مقلدین ظاہر ہوئے۔ ان مقلدین میں سے ایک شخص اپنے امام کی تقلید اس وقت بھی کرتا ہے جب اس کا مذہب دلائل سے دور ہے۔ گویا وہ امام کوئی ایسا نبی ہے جسے اس شخص کے پاس بھیجا گیا ہے۔ یہ حق سے گریز اور صحیح راستہ سے دوری ہے۔ اہل عقل میں سے کسی نے اس روش کو درست نہیں کہا ہے"۔

وہ مزید کہتے ہیں:

"جس شخص نے اماموں میں سے کسی ایک امام کی تقلید کی، پھر وہ دوسرے امام کی تقلید کرنا چاہتا ہے تو کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ راجح جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے۔ اگر وہ مسلک جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے، ایسا ہے جس میں فیصلہ بھی رد کر دیا جاتا ہے تو ایسے مسلک کی طرف منتقل ہونا جائز نہیں ہے جو توڑ دیا جائے؛ کیونکہ وہ اسی لئے قابل رد ہوا ہے کہ وہ باطل ہے۔ لیکن اگر دونوں مسالک کے دلائل قریب قریب ہوں تو کسی کی بھی تقلید کرنا اور کسی کی طرف منتقل ہونا جائز ہے؛ اس لئے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے لے کر چاروں فقہی مسالک کے ظاہر ہونے کے زمانہ تک لوگوں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ جس عالم کی چاہتے تقلید کر لیتے۔ اس پر کسی معتبر شخصیت نے اعتراض نہیں کیا ہے۔ اگر یہ غلط ہوتا تو علماء اس پر لازماً ٹوکتے اور اس سے منع کرتے۔"(۱)

(۱) قواعد الاحکام فی مصالح الانام، صفحہ ۳۰۴، مؤسسۃ الریان بیروت ۱۹۹۸ء

[اختلاف مجتہدین میں برحق رائے]

جب مذکورہ بالا تفصیلات ثابت ہوگئیں تو اب یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد سے جو بھی حکم بیان کرتا ہے وہ صاحب شریعت رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب ہوگا۔ خواہ وہ نبی کریم ﷺ کے کسی لفظ کی طرف منسوب ہو، یا لفظ سے ماخوذ کسی علت کی طرف منسوب ہو۔ اور جب حقیقت یہ طے پائی تو ہر اجتہاد میں دو حالتیں ہوں گی: ایک یہ کہ صاحب شرع ﷺ نے ایک لفظ سے کیا یہی معنی مراد لیا ہے یا کوئی اور معنی؟ اور یہ کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے ایک حکم بیان فرمایا تو اس وقت آپ کے دل میں اس حکم کی یہی علت وجہ حکم تھی یا کوئی اور علت اس حکم کا مدار تھی؟ اس حالت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے کہ ایک ہی مسئلہ میں دو رایوں کے اندر کیا دونوں صحیح ہیں یا کوئی ایک رائے صحیح ہے؟ تو کہا جائے گا کہ دو مجتہدین میں سے صرف ایک مجتہد کی رائے درست ہے اور دوسرے مجتہد کی رائے غلط ہے۔ لیکن صحیح کس مجتہد کی رائے ہے؟ یہ متعین نہیں ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو احکام شریعت عطا فرمائے، ان میں ایک یہ بات بھی آپ ﷺ نے بہ صراحت یا دلالت کے طور پر اپنی امت کو عطا فرمائی کہ جب ان کے سامنے شریعت کے کچھ احکام باہم مختلف محسوس ہوں، یا کسی حکم شریعت کے کئی معانی متضاد نظر آئیں تو اس وقت ان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اجتہاد کریں اور صحیح حکم کو معلوم کرنے کے لیے پوری کوشش صرف کردیں۔ اجتہاد اور کوشش کے نتیجہ میں جس مجتہد کے نزدیک جو حکم متعین ہو جائے، اس مجتہد پر اسی حکم کی اتباع واجب ہے۔ ٹھیک جس طرح نبی کریم ﷺ نے امت کو یہ حکم دیا کہ جب تاریک رات میں ان پر قبلہ مشتبہ ہو جائے تو وہ اندازہ اور تحری کریں اور جس سمت قبلہ ہونے کا اندازہ ہو اسی سمت رخ کر کے نماز پڑھیں۔ گویا یہ ایسا حکم ہے جس کو تحری اور اندازہ کے ساتھ ہی شریعت نے وابستہ کیا ہے۔ جس طرح نماز کے واجب ہونے کو وقت نماز آنے کے ساتھ وابستہ کیا ہے، اور بچہ پر شریعت کی پابندی کو اس کے بالغ ہونے سے وابستہ کیا ہے۔ اس دوسری حالت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے کہ دو رایوں میں سے کیا صحیح ہے؟ تو اس وقت دیکھنا یہ ہوگا کہ اگر وہ مسئلہ ایسا ہے جس میں مجتہد کا اجتہاد رد کر دیا جاتا ہے تو اس کا اجتہاد قطعا

باطل ہوگا۔ اور اگر اس مسئلہ میں صحیح حدیث موجود ہو اور مجتہد نے اس کے خلاف فیصلہ کیا ہو تو اس کا اجتہاد ظنی طور پر باطل ہوگا۔ اور اگر دونوں مجتہدین اس راستہ پر چلیں جس پر انھیں چلنا چاہئے اور ان دونوں کی رائے نہ تو کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو، اور نہ کسی ایسے امر کے جس کی خلاف ورزی کی صورت میں قاضی اور مفتی کا اجتہاد رد کر دیا جاتا ہے تو اس وقت دونوں مجتہدین حق پر سمجھے جائیں گے۔

باب [سوم]

چار مسالک کو اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے پر تنبیہ

[اتباع مسالک اربعہ کی مصلحت]

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ ان چاروں مذاہب کو اختیار کرنے میں عظیم مصلحت ہے۔ اوران چاروں سے پوری طرح علاحدہ ہوجانے میں بہت بڑا نقصان ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

اول: پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شریعت کو جاننے کے معاملہ میں انھیں سلف پر اعتماد کرنا ہے۔ تابعین نے اس معاملہ میں صحابہ کرامؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا۔ اوراسی طرح ہر طبقہ میں علماء نے اپنے پہلے والوں پر اعتماد کیا۔ عقل بھی اسی طریقہ کو بہتر قرار دیتی ہے؛ اس لئے کہ شریعت کو جاننے کے دو راستے ہیں: یا تو نقل و روایت سے معلوم ہو یا استنباط سے معلوم ہو۔ نقل و روایت اسی وقت درست ہوسکیں گے جب ہر طبقہ اپنے سے پہلے والے طبقہ سے براہ راست متصل طور پر نقل کرے۔ اور استنباط کرنے کے لئے بھی ضروری ہوگا کہ متقدمین کے مسالک معلوم ہوں؛ تاکہ کسی مسئلہ میں ان سب کے اقوال کے خلاف جاکر خرق اجماع نہ کر بیٹھے۔ ان متقدمین کے مسالک پر بنیاد رکھے اوران سے مدد لے؛ اس لئے کہ تمام صنعتیں جیسے صرف ونحو، طبابت، شاعری، آہنگری اور رنگریزی وغیرہ اسی وقت سیکھی جاسکتی ہیں جب ان فنون والوں کے ساتھ رہا جائے، اس کے بغیر سیکھنا دشوار اور بعید ہے، اور ایسا پیش

نہیں آیا ہے؛ گرچہ عقلا یہ ناممکن نہیں ہے۔ پس جب سلف کے اقوال پر اعتماد کرنا ضروری ٹھہرا تو یہ بھی ضروری ہوگا کہ سلف کے وہ اقوال صحیح سند کے ساتھ مروی ہوں، مشہور کتابوں میں انھیں مدون کیا گیا ہو، اوران پر علمی خدمت بھی انجام دی گئی ہو؛ بایں طور کہ جن اقوال میں کئی احتمالات ہیں ان میں راجح احتمال کو بیان کیا گیا ہو، کسی جگہ ان اقوال کے عموم میں تخصیص کی گئی ہو، کہیں کسی مطلق قول میں قید لگائی گئی ہو، جو اقوال باہم مختلف ہیں ان میں تطبیق دی گئی ہو، ان احکام کی علتیں بتائی گئی ہوں۔ اگر سلف کے اقوال میں یہ باتیں نہ پائی جائیں تو ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکے گا۔ اس زمانہ میں یہ خصوصیات صرف ان ہی چار مذاہب کے اندر پائی جارہی ہیں۔ ہاں مذہب امامیہ اور مذہب زیدیہ میں بھی یہ خصائص ہیں؛ لیکن یہ لوگ اہل بدعت ہیں، ان کے اقوال پر اعتماد کرنا درست نہیں ہے۔

دوم: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اتبعوا السواد الاعظم''[1] [سواد اعظم کی اتباع کرو۔] اب جب کہ مذاہب حقہ میں صرف یہی چار مذاہب باقی رہ گئے ہیں، تو ان ہی کی اتباع سواد اعظم کی اتباع ہوگی، اور ان چاروں سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنا ہوگا۔

سوم: جب عہد نبوی پر عرصہ دراز گزر گیا ہے، اس عہد سے فاصلہ بہت دور ہوگیا ہے اور امانتیں ضائع کی جانے لگی ہیں، تو اب یہ جائز نہیں رہا کہ ظالم قاضیوں اور خواہش پرست مفتیوں جیسے علماء سوء کے اقوال پر اعتماد کیا جائے، جب تک کہ وہ اپنی بات کو صراحتاً یا دلالتاً ان اسلاف میں سے کسی کی طرف منسوب نہ کریں جو صدق اور امانت و دیانت میں مشہور ہیں، اور ان کا وہ قول محفوظ بھی ہے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے اقوال پر اعتماد کرنا جائز ہوگا جن کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ ان میں اجتہاد کی شرطیں موجود تھیں یا نہیں۔ اگر سلف کے مذاہب میں علماء محققین ہم کو نظر آئیں تو سلف کے اقوال پر ان کی تخریجات اور کتاب وسنت سے ان کے استنباط میں ان کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر ان میں یہ بات ہمیں نظر نہ آئے تو تصدیق نہیں کی جاسکے گی۔ اسی نکتہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: قرآن کے ساتھ منافق کی بحث و تکرار اسلام کو منہدم کردے گی۔ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: جس کو اتباع کرنی ہو وہ گزرے لوگوں کی اتباع کرے۔

۱۔ دیکھیے: ابن ماجہ، ابواب الفتن، اس میں الفاظ ہیں ''فعلیکم بالسواد الاعظم''۔

[ابن حزم کی رائے]

پس ابن حزم نے تقلید کے سلسلہ میں جو بات کہی ہے وہ تمام لوگوں سے متعلق نہیں ہے۔ ابن حزم [ابو محمد علی بن احمد ظاہری، ۳۸۴-۴۵۶ھ] نے کہا:

''تقلید حرام ہے۔ اور کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کی بات بغیر دلیل کے اختیار کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم و لا تتبعوا من دونه اولیاء ''[1] [جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کی اتباع کرو، اللہ کے علاوہ دوسرے اولیاء کی اتباع نہ کرو] اور ارشاد ہے: ''واذا قیل لهم اتبعوا ما انزل الله قالوا بل نتبع ما الفینا علیه آبائنا''[2] [اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے اتارا ہے اس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس پر پایا اس کی اتباع کرتے ہیں] تقلید نہ کرنے والے کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئک الذین هداهم الله واولئک هم اولوا الالباب ''[3] [میرے بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے، جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں، پھر جو بہترین بات ہو اس کی اتباع کرتے ہیں، یہی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور یہی عقل مند بھی ہیں]۔ اور ارشاد ہے: ''فان تنازعتم فی شیء فردوه الی الله والرسول ان کنتم تؤمنون بالله والیوم الآخر ''[4] [اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی، پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے]۔

اللہ تعالیٰ نے اختلاف کے موقع پر قرآن اور سنت کے علاوہ کسی اور کی طرف رجوع

---

(۱) سورہ اعراف، آیت ۳،

(۲) سورہ بقرہ، آیت ۱۷

(۳) سورہ زمر، آیت ۱۷۔۱۸،

(۴) سورہ نساء، آیت ۵۹

کرنے کا اختیار نہیں دیا، اور اس طرح اختلاف کے وقت کسی انسان کے قول کی طرف رجوع کو حرام کر دیا، اس لئے کہ وہ غیر قرآن وسنت ہے۔ تمام کے تمام صحابہ کرام اور تمام کے تمام تابعین اور تمام کے تمام تبع تابعین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ خود بھی اس سے باز رہے اور دوسروں کو بھی منع کیا کہ کوئی انسان اپنے میں سے یا اپنے پہلوں میں سے کسی انسان کے قول کو اختیار کرے اور تمام مسائل میں اسی کی تقلید کرے۔ پس جان لینا چاہئے کہ جو شخص امام ابوحنیفہ کے تمام اقوال کو، یا امام مالک کے تمام اقوال کو، یا امام شافعی کے تمام اقوال کو، یا امام احمد کے تمام اقوال کو اپنا تا ہے، اور اپنے امام کے متبعین کے قول کو چھوڑ کر دوسرے کے قول کو اختیار نہیں کرتا ہے، اور جو کچھ قرآن اور سنت میں آیا ہے اس پر اعتماد نہیں کرتا ہے، جب تک کہ اس کو کسی متعین انسان کے قول کی طرف نہ پھیر دے، اس نے پوری امت کے اجماع کی ایسی مخالفت کی جو بالکل یقینی اور شک وشبہ سے بالا ہے۔ ایسے شخص کو اپنے لئے ابتدائی تین صدیوں میں کسی امام یا عالم کے یہاں کوئی تائید نہیں ملے گی۔ اس شخص نے مومنین کی راہ چھوڑ دی ہے۔ ہم ایسے مقام سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام فقہاء نے خود اپنی تقلید کرنے اور دوسروں کی تقلید کرنے سے منع فرمایا ہے، تو ان کی تقلید کرنے والا شخص ان ہی کے خلاف کر رہا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ اگر تقلید ہی کرنی ہے تو پھر حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت علی بن ابو طالبؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ یا ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر ان بعد والوں کی تقلید کیوں کر کی جائے۔ وہ ان سے بہتر کیسے ہو گئے؟ اگر تقلید درست ہوتی تو ان صحابہ کرام میں سے ہر صحابی زیادہ مستحق ہے کہ اس کی تقلید کی جائے۔"(۱)

[ابن حزم کی رائے کا مصداق]

ابن حزم کی یہ بات صرف ان لوگوں پر صادق آتی ہے جن کے اندر اجتہاد کی صلاحیت ہے، خواہ یہ صلاحیت صرف ایک ہی مسئلہ میں پائی جا رہی ہو۔ اسی طرح اس شخص پر صادق آتی ہے جس کے سامنے پوری طرح واضح ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ نے فلاں حکم دیا ہے یا فلاں چیز

(۱) دیکھئے: الاحکام فی اصول الاحکام، باب سادس وثلاثین

سے منع فرمایا ہے، اور وہ حدیث منسوخ بھی نہیں ہے، خواہ وہ اس کے لئے تمام احادیث پر نظر ڈالے اور زیر بحث مسئلہ میں موافق اور مخالف دونوں اقوال کا جائزہ لے؛ لیکن کہیں بھی اس حدیث کا ناسخ نہیں ملے۔ یا پھر وہ یہ دیکھے کہ علم کے متبحرین اور ماہرین کا ایک جم غفیر اس حدیث کو اختیار کر رہا ہے، اور مخالف شخص صرف قیاس یا استنباط وغیرہ کا سہارا لے رہا ہے۔ تو اس صورت میں حدیث رسول ﷺ کی خلاف ورزی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اس میں یا تو پوشیدہ نفاق ہے یا نمایاں حماقت۔

اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے فرمایا:

''یہ کتنی عجیب اور حیرتناک بات ہے کہ فقہاء مقلدین میں سے ایک شخص اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ اس کے امام کی دلیل کمزور ہے، اور کمزور دلیل کا جواب نہیں ہے؛ لیکن اس کے باوجود وہ اس کی تقلید کرتا ہے اور جو مسلک قرآن وسنت اور صحیح قیاس کے مطابق ہے اس کو چھوڑ کر اپنے امام کی تقلید پر اڑا رہتا ہے؛ بلکہ قرآن اور سنت کے ظاہر مفہوم کو دفع کرنے کے لئے حیلے کرتا ہے اور اپنے امام کے دفاع کے لئے غلط اور دور از کار تاویلات کا سہارا لیتا ہے۔''(۱)

وہ مزید فرماتے ہیں:

''ہمیشہ سے لوگوں کا یہ عمل رہا ہے کہ جو عالم میسر آئے ان سے انھوں نے مسائل پوچھ لئے، نہ تو کسی مسلک کی پابندی کی گئی اور نہ کسی پوچھنے والے پر اعتراض کیا گیا۔ یہاں تک کہ یہ مذاہب اور ان کے متعصب مقلدین ظاہر ہوئے۔ اب ایک شخص اپنے امام کی اتباع اس وقت بھی کرتا ہے جب اس کا مذہب دلائل سے دور ہو، وہ صرف امام کے قول کی تقلید کرتا ہے۔ گویا وہ کوئی نبی ہے جسے بھیجا گیا ہے۔ یہ طریقہ حق سے دوری اور صحیح راستہ سے گریز ہے، عقل والوں میں سے کسی نے اس کو پسند نہیں کیا ہے''۔

امام ابوشامہ [شہاب الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل مقدسی، ۵۹۹-۶۶۵ھ] فرماتے ہیں:

''جو شخص فقہ میں مشغول ہو اسے چاہئے کہ صرف ایک امام کے مذہب پر اکتفا نہ کرے، اور ہر مسئلہ میں اس رائے کو صحیح سمجھے جو قرآن اور سنت محکمہ سے قریب ہو۔

---

(۱) قواعد الاحکام فی مصالح الانام، صفحہ ۳۰۵، حوالہ سابق۔

اور یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے؛ بشرطیکہ وہ بیشتر علوم مذکورہ پر دسترس رکھتا ہو۔ اور وہ تعصب سے اور مخالفت کے طریقوں میں غور سے گریز کرے، کہ اس سے وقت کا ضیاع ہوتا ہے، اور صفائے ذہن مکدر ہوتا ہے۔ امام شافعی سے ثابت ہے کہ انھوں نے اپنی تقلید کرنے اور دوسروں کی تقلید کرنے سے منع فرمایا۔''(۱)

امام شافعی کے شاگرد امام مزنی [ابو ابراہیم اسماعیل بن یحیٰ، ۱۷۵۔ ۲۶۴ھ] نے اپنی کتاب 'مختصر' کی ابتداء میں فرمایا ہے:

''میری یہ کتاب امام شافعی کے علم کا اختصار ہے، اور ان کے اس جملہ کا خلاصہ ہے کہ: میں اس علم کو اس کے چاہنے والوں کے لئے قریب کررہا ہوں، میں ساتھ ہی یہ آگاہ بھی کرتا ہوں کہ امام شافعی نے اپنی تقلید اور دوسروں کی تقلید کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ہر شخص اس معاملہ میں اپنے دین پر نظر رکھے اور اپنے لئے محتاط رہے۔ یعنی جو لوگ امام شافعی کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں میں ان کو باخبر کردیتا ہوں کہ امام شافعی نے اپنی تقلید اور دوسروں کی تقلید کرنے سے منع فرمایا ہے۔''(۲)

تقلید کے خلاف ابن حزم کی مذکورہ بات ایسے عامی شخص پر بھی صادق آتی ہے جو کسی متعین فقیہ کی تقلید اس خیال کے ساتھ کرتا ہے کہ اس جیسے فقیہ سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی ہے، اور اس کا جو بھی قول ہے وہ یقیناً درست ہے۔ اور اپنے دل میں یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اس فقیہ کے خلاف دلیل ظاہر ہوجائے تب بھی وہ اس کی تقلید نہیں چھوڑے گا۔

ترمذی شریف میں حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''سمعت رسول الله ﷺ یقرأ: اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله، قال: انهم لم یکونوا یعبدونهم ولکنهم کانوا اذا احلوا لهم شیئا استحلوه واذا حرموا علیهم شیئا حرموه''(۳)

[میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے آیت پڑھی: انھوں نے اپنے

---

(۱) مختصر المؤمل فی الرد الی الامر الاول، صفحہ ۳۱۔

(۲) مختصر المزنی فی فروع الشافعیہ، صفحہ ۷ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۸ء

(۳) ترمذی، کتاب تفسیر القرآن

عالموں اور راہبوں کو اللہ کے ساتھ خدا بنا لیا تھا، آپ نے فرمایا: وہ لوگ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کر دیتے تو یہ ان کو حلال بنا لیتے اور جب وہ ان پر کسی چیز کو حرام کر دیتے تو یہ اسے حرام بنا لیتے تھے]۔

ابن حزم کی بات کا مصداق وہ شخص بھی ہے جو اس بات کو درست نہ قرار دیتا ہو کہ مثال کے طور پر کوئی حنفی آدمی کسی شافعی فقیہ سے مسئلہ پوچھ لے، یا اس کے برعکس کوئی شافعی آدمی کسی حنفی فقیہ سے مسئلہ پوچھ لے۔ اسی طرح وہ اس بات کو درست نہ قرار دیتا ہو کہ مثلاً کوئی حنفی شخص کسی شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھے؛ کیونکہ ایسا کرنے والا شخص ابتدائی صدیوں کے اجماع کا مخالف اور صحابہ کرام وتابعین کے خلاف کرنے والا ہوگا۔

[تقلید کی صحیح نوعیت]

اس کے برعکس ابن حزم کی بات کا مصداق وہ لوگ نہیں ہو سکتے ہیں جو نبی کریم ﷺ کے فرمان کے سوا کسی کے قول کو دین نہیں ٹھہراتے ہیں۔ جو اسی چیز کو حلال سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا ہے، اور اسی چیز کو حرام سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے؛ لیکن چونکہ انھیں رسول اللہ ﷺ کے اقوال کا علم نہیں ہے، نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ مختلف احادیث میں جمع وتطبیق کا طریقہ کیا ہے، نہ انھیں احادیث سے استنباط اور احکام معلوم کرنے کا طریقہ آتا ہے؛ اس لئے وہ کسی عالم راشد کی اتباع یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ وہ عالم اپنے قول میں صواب پر ہے، اور وہ ظاہراً جو کہہ رہا ہے رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع کرتے ہوئے فتوی دے رہا ہے۔ اگر ان کے خیال اور گمان کے برخلاف معاملہ ظاہر ہوگا تو وہ فوراً بغیر کسی بحث اور اصرار کے اس کی اتباع سے باز آجائیں گے۔ پس ایسے لوگوں کا یہ عمل درست ہے۔ اس کا انکار کوئی شخص کیسے کر سکتا ہے؛ جب کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے مسلمانوں کے درمیان پوچھنے اور بتانے کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ ایک ہی شخص سے ہمیشہ پوچھا جائے، یا کبھی ایک سے پوچھا جائے اور کبھی دوسرے سے پوچھا جائے؛ جب دل میں وہ پختہ ارادہ ہو جو ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا۔ اور یہ کیسے درست نہیں ہو سکتا ہے جب کہ ہم نے کبھی کسی فقیہ پر یہ ایمان نہیں رکھا کہ اللہ نے اس کو فقہ بذریعہ وحی بھیجی ہے، اور ہم پر

اس کی اطاعت فرض فرمائی ہے، اور یہ کہ وہ فقیہ معصوم ہے۔

اگر ہم ان فقہاء میں سے کسی ایک فقیہ کی اقتدا کرتے ہیں تو اس کے بارے میں اپنے اس علم کی وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ فقیہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کا عالم ہے؛ اس لئے اس عالم کا قول یا تو صریح قرآن اور سنت ہے، یا قرآن اور سنت ہی سے کسی طور پر مستنبط ہے۔ یا اس عالم کو قرائن سے معلوم ہوا کہ فلاں صورت میں شریعت کا حکم فلاں علت سے وابستہ ہے، اور اس پر اس کا قلب مطمئن ہے؛ اس لئے اس نے نئے مسئلہ کو جس کے بارے میں حکم نہیں ہے، شرعی حکم پر قیاس کیا ہے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بھی یہ علت پائی جائے تو وہاں شریعت کا حکم یوں ہوگا۔ اور قیاسی حکم شریعت کے عام حکم میں داخل ہے؛ لہٰذا یہ بھی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہے؛ البتہ اس کی نسبت میں ظن ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی کوئی مقلد کسی مجتہد کی تقلید نہیں کرتا؛ لیکن اگر ہم تک رسول معصوم ﷺ کی کوئی حدیث صحیح سند کے ساتھ پہنچی جو اس قیاسی رائے کے خلاف ہو اور ہم حدیث کو چھوڑ دیں اور اسی گمان وقیاس کی اتباع کریں تو ہم سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا؟ اور اس دن ہم کیا عذر پیش کرسکیں گے جب تمام لوگ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے؟

باب [چہارم]

چار مسالک کو اختیار کرنے میں لوگوں کا فرق اور ان کی ذمہ داری

چار مسالک کو اختیار کرنے کے معاملہ میں لوگوں کے چار درجے ہیں، اور ہر درجہ کے لوگوں کی ایک مخصوص حد ہے، جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔

اول: مجتہد مطلق منتسب کا درجہ، جو ان مسالک میں سے کسی صاحب مسلک کی طرف اپنی نسبت رکھتا ہے۔

دوم: تخریج کرنے والے کا درجہ، یہ مسلک کے اندر مجتہد ہوتا ہے۔

سوم: مسلک کے تبحر کا درجہ، جو مسلک کا حافظ اور اس کا ماہر ہوتا ہے، اور اپنے اصحاب کے مسلک پر اپنی مہارت اور یادداشت کے مطابق فتویٰ دیتا ہے۔

چہارم: مقلد محض، جو مسالک کے علماء سے پوچھتا ہے، اور ان کے فتویٰ پر عمل کرتا ہے۔

ان چاروں درجات میں ہر درجہ کے لئے شرائط اور احکام ہیں جو فقہاء کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ کچھ لوگ ان درجوں میں فرق نہیں کر پاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ان احکام میں گڈمڈ کا شکار ہو جاتے ہیں، اور سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ احکام متضاد ہیں؛ اس لئے ہم نے ضرورت محسوس کی کہ ہر درجہ کے احکام واضح کر دئے جائیں۔ چنانچہ ذیل میں ہر درجہ کے لئے علاحدہ فصل مقرر کی جاتی ہے اور اس میں اس درجہ کے احکام ذکر کئے جاتے ہیں۔

[پہلی] فصل: مجتہد مطلق منتسب

مجتہد مطلق منتسب کی شرائط پیچھے بیان کی جا چکی ہیں، اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مجتہد مطلق منتسب علم حدیث، اور اپنے اصحاب سے مروی فقہ اور اصول فقہ کا جامع ہوتا ہے، جیسا کہ کبار علماء شافعی ہیں۔ یہ علماء اگر چہ فی نفسہ بہت زیادہ ہیں، لیکن دوسرے مراتب کی بہ نسبت ان کی تعداد قلیل ہے۔

ان علماء کے کلام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طریق کار یہ ہے کہ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری جیسے مجتہدین جن کے مذاہب اور فتاویٰ مقبول ہیں، ان سے منقول ہونے والے مسائل کو یہ لوگ موطا امام مالک اور بخاری و مسلم پر پیش کرتے ہیں، پھر ترمذی اور ابوداؤد کی احادیث کے سامنے لاتے ہیں۔ پھر جو مسئلہ صراحتاً یا اشارتاً سنت کے مطابق نظر آتا ہے اسے اختیار کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ اور جو مسئلہ سنت کے صاف خلاف ملتا ہے اسے رد کر دیتے ہیں اور اس پر عمل چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جس مسئلہ میں احادیث اور روایات مختلف نظر آتی ہیں، وہاں ان روایات میں باہم تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لئے کبھی جو حدیث مبہم ہے، دوسری توضیحی حدیث سے اس کے ابہام کو ختم کرتے ہیں اور ہر حدیث کو علاحدہ صورت پر محمول کرتے ہیں، کبھی دوسرے طریقے اپناتے ہیں۔ مثلاً مسئلہ اگر سنن اور آداب کے باب سے ہے تو ہر عمل کو سنت قرار دیتے ہیں، اور اگر مسئلہ حلال و حرام کے باب سے یا قضا کے باب سے متعلق ہے اور اس مسئلہ میں صحابہ، تابعین اور مجتہدین کے درمیان اختلاف ہے تو اس مسئلہ میں دو قول یا چند اقوال قرار دے دیتے ہیں، اور ان میں سے کسی بھی قول کے اپنانے والے پر نکیر نہیں کرتے، اور اس معاملہ میں وسعت اور گنجائش تصور کرتے ہیں؛ کیونکہ ہر قول کے حق میں حدیث اور آثار موجود ہیں۔

پھر وہ اپنی پوری کوشش کر کے یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان میں افضل اور راجح کون ہے؟ بایں طور کہ قوی روایت کون سی ہے، یا صحابہ کرام کی اکثریت کا عمل کس پر ہے، یا جمہور مجتہدین کا مسلک کون سا ہے، یا قیاس کے مطابق اور دوسری نظیروں سے ہم آہنگ کون سا قول ہے۔ پھر اس افضل اور راجح پر عمل کرتے ہیں؛ لیکن دوسرے قول کے اختیار کرنے والوں میں سے کسی پر

کچھ نکیر نہیں کرتے ہیں۔

اگر اس مسئلہ میں مذکورہ دونوں طبقوں کی کتب حدیث سے کوئی دلیل نہیں ملی تو وہ تیسرے طبقہ کی کتب حدیث میں غور وفکر کر کے ان اقوال کے دلائل ڈھونڈتے ہیں، اور یہ دیکھتے ہیں کہ مجتہدین نے اپنے کلام میں اس کی کیا دلیل اور علت ذکر کی ہے۔ اگر کسی چیز پر ان کا دل مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر مجتہدین کی ذکر کردہ چیزوں میں سے کسی پر ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا ہے، اور اطمینان کسی اور قول پر ہوتا ہے اور مسئلہ کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں مجتہد کا اجتہاد نافذ ہو جاتا ہے، اور اس میں پہلے سے کوئی اجماع نہیں ہے اور ان کے نزدیک اس کی کوئی صریح دلیل آجاتی ہے تو اللہ کی مدد سے اور اس پر بھروسہ کرتے ہوئے اس قول کو اختیار کر لیتے ہیں؛ لیکن ایسا بہت ہی شاذ ونادر ہے، اور اس تک رسائی بھی بہت مشکل ہے، اس کی دشواریوں سے وہ بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اور اگر ان کے نزدیک کوئی صریح دلیل نہیں آتی ہے، تو وہ سواد اعظم کی اتباع کرتے ہیں۔

جس مسئلہ میں انھیں سلف کی طرف سے کوئی صراحت یا صحیح علت نہیں معلوم ہوتی ہے اس میں یہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ قرآن اور سنت کی کوئی دلیل یا اشارہ یا ایما مل جائے، یا صحابہ اور تابعین کی کوئی روایت مل جائے، اگر ایسی کوئی دلیل مل جاتی ہے تو اسے اپنا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ طریقہ نہیں ہے کہ کسی ایک عالم کی اتباع اس کے تمام اقوال میں کی جائے، خواہ ان اقوال پر اطمینان قلب ہو یا نہ ہو۔

یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، اگر اس کی صداقت معلوم کرنی ہو تو بیہقی [ابو بکر احمد بن حسین، ۳۸۴۔۴۵۸ھ] کی کتابیں، معالم السنن اور بغوی کی شرح السنۃ دیکھی جائیں۔ یہ فقہائے محدثین میں سے محققین کا طریقہ ہے۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ یہ نہ تو اہل الحدیث میں سے وہ ظاہریہ ہیں جو قیاس اور اجماع کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، اور نہ اصحاب الحدیث میں سے وہ متقدمین ہیں جو مجتہدین کے اقوال کو سرے سے دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ البتہ یہ لوگ اصحاب الحدیث سے زیادہ مشابہ ہیں، اس لئے کہ انھوں نے مجتہدین کے اقوال میں وہی عمل کیا جو ان مجتہدین نے صحابہ اور تابعین کے مسائل میں کیا تھا۔

[دوسری] فصل: مجتہد فی المذہب

اس فصل میں چند مسائل ہیں:

[۱] مسئلہ : [مجتہد فی المذہب کا علم]

جاننا چاہئے کہ مجتہد فی المذہب پر واجب ہے کہ اسے اس قدر احادیث اور روایات معلوم ہوں جن کے ذریعہ وہ صحیح حدیث کی خلاف ورزی کرنے اور سلف کے اجماع کے خلاف جانے سے بچ سکے۔ اور فقہ کے اتنے دلائل اسے معلوم ہوں جن کے ذریعہ وہ اپنے اصحاب کے اقوال میں ان کے مآخذ کو جان سکے۔

'فتاویٰ سراجیہ' کی اس عبارت کا یہی مطلب ہے کہ:

''کسی کو اس وقت تک فتویٰ نہیں دینا چاہئے جب تک وہ یہ جان نہ لے کہ علماء کے اقوال کیا ہیں؟ اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ کہاں سے کہا ہے؟ اور لوگوں کے معاملات کو وہ جان جائے۔ لہٰذا اگر وہ علماء کے اقوال کو جانتا ہو لیکن ان کے مسالک نہ جانتا ہو، پھر اس سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ جن علماء کے مذاہب کو اس نے اختیار کر رکھا ہے، وہ علماء اس مسئلہ میں فلاں رائے پر متفق ہیں، تو وہ یہ جواب دے سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب دراصل حکایت اور نقل ہوگا۔ اور اگر اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہو تو وہ یوں جواب دے سکتا ہے کہ یہ چیز فلاں کے قول میں جائز ہے اور فلاں کے قول میں جائز نہیں ہے؛ البتہ وہ ان اختلافی آراء میں سے کسی رائے کو منتخب کر کے صرف اسی رائے کے مطابق جواب نہیں دے گا، جب تک کہ اسے ان آراء کی دلیلیں نہ معلوم ہوں۔

'الفصول العمادیہ' کی فصل اول میں تحریر ہے: اگر کوئی شخص اہل اجتہاد میں سے نہیں ہے، تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ فتویٰ دے، ہاں صرف نقل و حکایت کے طور پر بتا سکتا ہے۔ لہٰذا اسے فقہاء کے جو اقوال یاد ہیں ان کو وہ بیان کرے گا۔ امام ابو یوسف،

امام زفر اور امام عافیہ بن یزید سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے قول کے مطابق فتوی دے جب تک کہ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے کیا دلیل پیش نظر رکھی ہے۔

'الفصول العمادیہ' میں مزید تحریر ہے: بعض فقہاء سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا: اگر کسی شخص کو ہمارے اصحاب (علماء وفقہاء) کی تمام کتابیں حفظ ہوں تب بھی فتوی دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عملی تربیت حاصل کرے، تاکہ اسے فتویٰ دینا آسکے؛ اس لئے کہ بہت سے مسائل میں ہمارے فقہاء نے اپنے علاقہ کے عرف ورواج اور ان کے معاملات کی رعایت سے فتویٰ دیا ہے۔ پس ہر مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علاقہ اور اپنے زمانہ کے ان عرف ورواج سے واقف ہو جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں۔

عمدۃ الاحکام میں المحیط کے حوالہ سے ہے: اہل اجتہاد وہ لوگ ہیں جو قرآن، حدیث، صحابہ کے آثار اور فقہ کے طریقوں سے واقف ہوں۔

خانیہ میں بعض فقہاء سے منقول ہے: اجتہاد کے لئے ضروری ہے کہ المبسوط یاد ہو، ناسخ ومنسوخ، محکم اور مؤول کا علم ہو، اور لوگوں کے عرف وعادات سے آگاہی ہو۔

سراجیہ میں ہے: کہا گیا ہے کہ اجتہاد کی ادنی شرط یہ ہے کہ المبسوط حفظ ہو"۔

یہ تمام روایات خزانۃ المفتین میں درج ہیں۔

میرے نزدیک ان تمام عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ دو قسم کے مفتیوں میں فرق ہے۔ ایک وہ مفتی جو صاحب تخریج ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ مفتی جو اپنے فقہاء کے مسلک کا ماہر وتبحر ہوتا ہے، اور اس کا فتویٰ صرف مسئلہ کو نقل اور بیان کرنا ہوتا ہے، وہ اجتہاد سے فتویٰ نہیں دیتا ہے۔

[۲] مسئلہ : [مسائل کی چار قسمیں]

فقہاء محققین کے نزدیک مسائل چار طرح کے ہیں:

پہلی قسم ان مسائل کی ہے جو ظاہر مذہب میں متعین ہو چکے ہیں۔ اس قسم کے مسائل کا حکم یہ ہے کہ وہ انھیں ہر حال میں قبول کرتے ہیں، خواہ وہ اصول مذہب کے مطابق ہوں یا خلاف۔ اسی لئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ صاحب ہدایہ وغیرہ ہم جنس مسائل میں فرق ظاہر کرنے کے لئے تکلف سے کام لیتے ہیں۔

دوسری قسم ان مسائل کی ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمدؒ سے شاذ روایت کے بطور منقول ہیں۔ یہ مسائل اگر اصول کے مطابق ہوں تب ہی انھیں قبول کیا جائے گا؛ اسی لئے ہدایہ وغیرہ میں قوت دلیل کی وجہ سے بعض شاذ روایات کی تصحیح کی گئی ہے۔

تیسری قسم کے مسائل وہ ہیں جنھیں متاخرین نے تخریج کیا ہے، اور ان پر جمہور اصحاب متفق ہیں۔ ان مسائل پر بھی ہر حال میں فتویٰ دیا جائے گا۔

چوتھی قسم ایسے مسائل کی ہے جنھیں متاخرین نے تو تخریج کیا ہے؛ لیکن جمہور اصحاب نے ان سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ مفتی ایسے مسائل کو اصول اور سلف کے کلام کے نظائر پر پیش کرے گا، جو مسئلہ ان کے مطابق ہوا سے اختیار کرے گا، اور جو مطابق نہ ہوا سے ترک کر دے گا۔

'خزانۃ الروایات' میں فقیہ ابو اللیث [نصر بن محمد، متوفی ۳۷۳ھ] کی کتاب ''بستان'' کے 'باب الاخذ عن الثقات' سے نقل کیا گیا ہے کہ:

> ''اگر کوئی شخص کوئی حدیث سنے یا کسی کا قول سنے تو اگر سنانے والا آدمی ثقہ نہیں ہے تو اس کو قبول کرنا درست نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ قول اصول کے مطابق ہو تب اس پر عمل کرنا جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔ اسی طرح اگر کہیں کوئی حدیث یا مسئلہ لکھا ہوا ملے تو اس پر عمل کرنا تب ہی جائز ہوگا جب وہ اصول کے موافق ہو، ورنہ جائز نہیں ہوگا۔''(۱)

'البحر الرائق' میں ابو اللیث سمرقندی سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) خزانۃ الروایات، فصل فی کیفیۃ الافتاء، مخطوطہ مکتبہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

''ابونصر [محمد بن محمد، متوفی ۳۰۵ھ] کے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا گیا کہ آپ کے سامنے چار کتابیں ہیں: ابراہیم بن رستم [ابوبکر مروزی، متوفی ۲۱۱ھ] کی کتاب، خصاف [احمد بن عمرو شیبانی، متوفی ۲۶۱ھ] کی آداب القاضی، کتاب المجرد اور ھشام [بن عبید اللہ رازی، متوفی ۲۰۱ھ] والی کتاب النوادر۔ کیا ہمارے لئے ان کتابوں سے فتویٰ دینا جائز ہے یا نہیں؛ جب کہ یہ کتابیں آپ کے نزدیک پسندیدہ ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: جو کچھ ہمارے اصحاب سے صحیح طور پر ثابت ہے وہ محبوب و پسندیدہ علم ہے؛ لیکن جہاں تک فتویٰ دینے کی بات ہے تو میں یہ درست نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کا فتویٰ دے جسے وہ خود سمجھ نہیں رہا ہو، اور اس طرح لوگوں کا بوجھ اپنے سر اٹھالے۔ اگر مسائل اپنے اصحاب کی نسبت کے ساتھ بہت مشہور، واضح اور نمایاں ہیں تو میں امید کرتا ہوں کہ نئے واقعات میں ان پر اعتماد کی گنجائش ہو سکے گی۔''(۱)

[۳] مسئلہ : [اختلافی مسئلہ میں فتویٰ]

اگر زیر بحث مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہو تو حکم یہ ہے کہ مجتہد فی المذہب ان تینوں کے اقوال میں سے ایسے قول کو اختیار کرے گا جس کی دلیل زیادہ قوی، جس کی علت زیادہ مطابق قیاس اور جس میں لوگوں کے لئے زیادہ سہولت ہو۔ اسی لئے علماء حنفیہ کی جماعتوں نے استعمال شدہ پانی کی پاکی کے مسئلہ میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا۔ اور عصر و عشاء کے ابتدائی وقت میں اور مزارعت (بٹائی) کے جواز میں صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا۔ ایسی مثالوں سے ان فقہاء کی کتابیں اتنی بھری ہیں کہ مثالیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شافعی مسلک کے اندر بھی یہی معاملہ ہے۔ چنانچہ ''المنہاج'' وغیرہ میں ہے کہ میراث کے مسئلہ میں فقہ شافعی کی اصل رائے یہ ہے کہ ذوی الارحام میراث کے مستحق نہیں ہوں گے؛ لیکن متاخرین شافعیہ نے بیت المال کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ان کے وارث ہونے کا فتویٰ دیا۔ فقیہ یمن ابن زیاد [ابونصر عبد السلام یمنی شافعی، متوفی ۹۵۷ھ] نے اپنے فتاویٰ میں ایسے مسائل نقل کئے ہیں جن میں متاخرین فقہائے شافعیہ نے مسلک کے برعکس فتویٰ دیا۔ مثال کے طور پر سونے و چاندی اور سامان تجارت کی زکاۃ میں پیسوں سے زکاۃ نکالنے کا مسئلہ ہے۔

(۱) البحر الرائق، ۶/۱ ۷ مطبوعہ پاکستان

بلقینی [ابوحفص سراج الدین عمر بن رسلان، ۷۲۴-۸۰۵ھ] نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور کہا: میں اس کو جائز سمجھتا ہوں؛ البتہ یہ مسلک شافعی کے خلاف ہے، اس مسئلہ میں بلقینی نے بخاری کی پیروی کی ہے۔ اسی طرح اشراف علویین (سادات) کو زکاۃ دینے کا مسئلہ ہے۔ امام فخر الدین رازی [ابوعبداللہ محمد بن عمر، ۵۴۴-۶۰۶ھ] نے فتویٰ دیا کہ اس زمانہ میں جب کہ انھیں بیت المال سے اپنا حصہ نہیں مل رہا ہے اور وہ تنگدست ہو گئے ہیں، ان کو زکاۃ دینا جائز ہے۔ ایسے ہی ایک مسئلہ شہد کی مکھیوں کو ان کے چھتہ اور اس میں جو کچھ موم وغیرہ ہے، ان سب کے ساتھ فروخت کرنے کا ہے، بلقینی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ابن زیاد نے نقل کیا ہے کہ ابن عجیل [ابوالعباس احمد بن موسیٰ یمنی، متوفی ٦۹۰ھ] نے فرمایا: زکاۃ کے باب میں تین مسائل ایسے ہیں جن میں اصل مسلک کے خلاف فتویٰ دیا گیا ہے: زکاۃ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا، پوری زکاۃ ایک ہی شخص کو دینا اور صرف ایک مصرف میں زکاۃ دینا۔

[مصنف کی رائے]

یہاں اس مسئلہ میں میری ایک رائے ہے۔ وہ یہ کہ مسلک شافعی کا مفتی خواہ وہ مجتہد فی المذہب کے درجہ کا ہو یا متبحر فی المذہب ہو، اگر کسی مسئلہ میں اسے اپنے مسلک کے خلاف دوسری رائے اختیار کرنے کی ضرورت ہو تو اسے امام احمد کا مسلک اختیار کرنا چاہیے؛ اس لئے کہ وہ علم اور دیانت میں امام شافعیؒ کے سب سے ممتاز شاگرد رہے ہیں، اور ان کا مسلک درحقیقت امام شافعی کے مسلک کی فرع اور اسی کی آراء میں سے ایک رائے ہے۔ (واللہ اعلم)۔

[تیسری] فصل: متبحر فی المذہب

متبحر فی المذہب وہ ہے جو اپنے مسلک کی کتابوں کا حافظ ہوتا ہے۔ اس فصل میں چند مسائل ہیں:

[۱] مسئلہ: [متبحر فی المذہب کا علم]

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ متبحر فی المذہب کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحیح الفہم ہو، عربی زبان، کلام کے اسالیب اور ترجیح کے مراتب سے واقف ہو، فقہاء کے کلام کے معانی خوب خوب سمجھتا ہو۔

عام طور پر اس سے یہ بات مخفی نہ ہو کہ جو جملہ بظاہر مطلق آیا ہے اس سے مراد قید کے ساتھ ہے، اور جو جملہ بظاہر قید کے ساتھ آیا ہے وہاں مراد مطلق ہے۔ ابن نجیم نے البحر الرائق میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ (۱)

اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فتویٰ دو میں سے کسی ایک بات کے ذریعہ ہی دے: یا تو اس کے پاس صحیح اور قابل اعتماد سند ہو جو امام تک پہنچتی ہو، یا وہ مسئلہ کسی ایسی مشہور کتاب میں درج ہو جسے لوگوں میں قبولیت حاصل ہے۔

'النہر الفائق' کے 'کتاب القضاء' میں تحریر ہے:

'' مقلد مفتی کے لئے مجتہد کے حوالہ سے کوئی رائے نقل کرنے کی دو صورتیں ہیں: یا تو مجتہد تک اس کی سند متصل ہو، یا مجتہد کی رائے ایسی کتاب سے معلوم ہوئی ہو جو معروف اور متداول ہے، جیسے امام محمد بن حسن کی کتابیں اور ان کے علاوہ دوسری مشہور تصنیفات مجتہدین ہیں؛ اس لئے کہ ایسی رائے خبر متواتر یا خبر مشہور کے درجہ میں ہے۔ امام رازی نے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ لہذا اگر آج امام محمد کی نوادر کے کچھ نسخے دستیاب ہوں تو ان آراء کو امام محمد کی طرف منسوب کرنا یا امام ابو یوسف کی طرف نسبت کرنا درست نہ ہوگا؛ اس لئے کہ یہ کتاب ہمارے زمانہ میں اور ہمارے علاقہ میں مشہور نہیں رہی ہے، اور نہ متداول ہوئی ہے۔ ہاں اگر نوادر کے حوالہ سے کوئی بات کسی مشہور اور معروف کتاب میں پائی جائے، مثلاً ہدایہ اور مبسوط وغیرہ میں نوادر کے اقتباسات ہوں تو ان پر اعتماد در اصل ان کتابوں پر اعتماد ہوگا۔''(۲)

'فتاویٰ القنیہ' میں 'مفتی سے متعلق باب' کے اندر ہے:

'' اگر کسی فقیہ کی رائے اور مسلک کسی معروف کتاب میں ملے، جس کے نسخے متداول ہوں، تو اس کتاب کو دیکھنے والے کے لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ فلاں نے یا فلاں نے یوں کہا ہے؛ اگر چہ وہ بات اس نے کسی سے نہ سنی ہو، جیسے امام محمد بن حسن کی کتابیں اور امام مالک کی موطا وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو مختلف علوم کی اصناف میں

(۱) دیکھئے: البحر الرائق، کتاب القضاء، ۶/ ۲۶۵۔

(۲) ا۔ النہر الفائق ۳/ ۶۰۲، دار الکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۲ء

تصنیف کی گئی ہیں؛ اس لئے کہ ان آراء و اقوال کا اس طور موجود ہونا خبر متواتر اور شہرت کے درجہ میں ہے، جن کے لئے سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔''(۱)

[۲] مسئلہ : [اگر مسلک کے برخلاف صحیح حدیث ملے]

اگر متبحر فی المذہب شخص کو ایسی صحیح حدیث ملے جو اس کے مسلک کے خلاف ہو، تو کیا وہ اس مسئلہ میں مسلک کو ترک کر کے حدیث کو اختیار کر لے گا؟ اس مسئلہ میں بڑی لمبی بحث ہے۔

'خزانۃ الروایات' کے مصنف نے 'دستور المساکین' کے حوالہ سے اس موضوع پر مفصل گفتگو کی ہے، ہم وہاں سے ان کی بات بعینہ نقل کرتے ہیں:

''اگر کہا جائے کہ مقلد غیر مجتہد شخص اگر عالم ہو، استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو، اصول کے قواعد اور نصوص و روایات کے معانی کو جانتا ہو، تو کیا اس کے لئے ان پر عمل کرنا جائز ہوگا؟ اور یہ کیسے جائز ہوگا جب کہ کہا گیا ہے کہ غیر مجتہد کے لئے صرف یہی جائز ہے کہ وہ اپنے مسلک کی روایات اور اپنے امام کے فتاویٰ پر عمل کرے، نصوص و روایات کے معانی اور ان پر عمل میں مشغول نہ ہو جیسا کہ عامی شخص کے لئے حکم ہے۔ تو کہا گیا کہ یہ بات ایسے عامی شخص کے حق میں ہے جو نرا جاہل ہے، نہ نصوص اور احادیث کے معانی کو جانتا ہے اور نہ ان کی تشریحات سے واقف ہے۔ لیکن جو شخص ایسا عالم ہے جو نصوص اور روایات کو سمجھتا ہے، وہ درایت کا علم بھی رکھتا ہے، اور اس کے نزدیک محدثین سے یا ان کی قابل اعتماد، مشہور اور متداول کتابوں سے ان روایات کی صحت ثابت ہو جاتی ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ ان پر عمل کرے، خواہ وہ اس کے مسلک کے خلاف ہوں۔ اس رائے کی تائید امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کے اقوال سے نیز صاحب 'ہدایہ' کے اس قول سے ہوتی ہے جو 'روضۃ العلماء الزندوستیۃ' میں فضل الصحابہ میں آیا ہے۔ امام ابوحنیفہ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کوئی رائے دیں، اور اللہ کی کتاب اس رائے کے خلاف ہو؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی کتاب کے سامنے میرے قول کو ترک کردو۔ پوچھا گیا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی حدیث اس کے خلاف ہو؟ آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی حدیث

(۱) القنیۃ المنیۃ لتتمیم الغنیۃ، فصل فیما یتعلق بالمفتی والمستفتی، مطبوعہ کلکتہ ۱۲۴۵ھ۔

کے سامنے میرے قول کو ترک کردو۔ دریافت کیا گیا: اگر صحابہ کا قول اس کے خلاف ہو؟ فرمایا: صحابہ کے قول کے سامنے میرے قول کو ترک کردو۔

امتاع میں ہے کہ امام بیہقی نے السنن میں قراءت پر کلام کے ضمن میں اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا: اگر میں نے کوئی بات کہی، اور رسول اللہ ﷺ کا قول میرے قول کے خلاف ہو، تو جو بات رسول اللہ ﷺ کی حدیث صحیح سے ثابت ہو وہی قابل اتباع ہے؛ لہٰذا میری تقلید مت کرو۔ امام الحرمین [ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ جوینی، ۴۱۹-۴۷۸ھ] نے 'النہایہ' میں امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: اگر تمہارے پاس کوئی ایسی صحیح حدیث پہنچے جو میرے مسلک کے خلاف ہو تو اس حدیث کی اتباع کرو، اور یہ سمجھ لو کہ وہی میرا مسلک ہے۔ امام شافعی سے صراحتاً یہ بھی ثابت ہے کہ اگر تمہارے پاس میرا کوئی مسلک پہنچے اور تمہارے نزدیک اس مسلک کے خلاف صحیح حدیث ثابت ہو جائے تو سمجھ لو کہ جو صحیح حدیث سے ثابت بات ہے وہی میرا مسلک ہے۔ خطیب [ابو بکر احمد بن علی بغدادی ۳۹۲۔ ۴۶۳ھ] نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ شافعی فقہاء میں سے دارکی [ابو القاسم عبد العزیز بن عبد اللہ، متوفی ۳۷۵ھ] سے فتویٰ پوچھا جاتا تو وہ بسا اوقات امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے مسلک سے ہٹ کر فتویٰ دیتے۔ ان سے کہا جاتا کہ یہ فتویٰ ان دونوں ائمہ کے قول کے خلاف ہے؟ تو وہ فرماتے: تمہارا برا ہو، فلاں نے فلاں کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے اس طرح روایت کیا ہے، اور حدیث کو اختیار کرنا ان دونوں کے وہ اقوال اختیار کرنے سے اولیٰ ہے جو حدیث کے خلاف ہیں۔

اسی طرح اس کی تائید 'ہدایہ' میں بیان روزہ دار کے پچھنہ لگانے کے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے کہ: اگر کسی شخص نے پچھنہ لگوایا، اور اسے خیال ہوا کہ پچھنہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس خیال کی وجہ سے اس نے جان بوجھ کر کھالیا تو اس پر قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے، اس لئے کہ اس کا یہ خیال کسی شرعی دلیل پر مبنی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ کسی فقیہ نے اس کو روزہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیا ہو؛ اس لئے کہ فتویٰ اس شخص کے حق میں دلیل شرعی ہے۔ اور اگر اس کے پاس حدیث پہنچی اور اس نے

حدیث کو قابل اعتماد پایا تو امام محمدؒ کے نزدیک یہی حکم ہوگا؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان مفتی کے قول سے بلند ہے۔ الکافی اور الحمیدی میں ہے کہ قول رسول ﷺ کا درجہ مفتی کے قول سے بلند ہے، تو جب قول مفتی دلیل شرعی بنتا ہے تو قول رسول ﷺ بدرجہ اولی اس کے حق میں دلیل ہوگا۔ لیکن امام ابو یوسف کی رائے اس کے خلاف ہے؛ اس لئے کہ عامی پر واجب ہے کہ وہ فقہاء کی بات پر عمل کرے؛ کیونکہ وہ حدیث کو جاننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے؛ لیکن اگر وہ حدیث کے مفہوم کو سمجھ لے تو اس پر کفارہ واجب ہوگا۔ مناوی میں ہے کہ یہ رائے بالاتفاق ہے۔ اور امام ابو یوسف کے قول کا' کہ عامی پر فقہاء کی اتباع واجب ہے' جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق ایسے عامی سے ہے جو نرا جاہل ہے اور احادیث کے معانی اور ان کے مفہوم کو نہیں جانتا ہے۔ امام ابو یوسف کا یہ جملہ بھی کہ "وہ (عامی) حدیث کو جاننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے" اسی مفہوم کی جانب اشارہ کر رہا ہے، اسی طرح ان کا یہ جملہ کہ: "اگر عامی حدیث کے مفہوم کو سمجھ لے تو کفارہ واجب ہوگا" بھی اسی جانب اشارہ کر رہا ہے کہ عامی سے مراد غیر عالم شخص ہے۔ حمیدی میں ہے کہ عامی کا لفظ عوام کی طرف نسبت رکھتا ہے، اور عوام جاہل ہوتی ہے۔ ان اشاروں سے معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف کی مراد بھی ایسا عامی شخص ہے جو جاہل ہے اور حدیث کے معنی یا اس کی تشریح کو نہیں جانتا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام محمد رحمہم اللہ کے ان مذکورہ اقوال سے اس قول کی تردید ہوجاتی ہے کہ "نص کے برخلاف روایت پر عمل کرنا واجب ہے۔"(۱)

اس مسئلہ میں ایک دوسرا قول بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اس شخص نے اجتہاد کی صلاحیتیں جمع نہیں کی ہیں تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلک کے خلاف حدیث پر عمل کرے؛ اس لئے کہ اسے نہیں معلوم کہ آیا وہ حدیث منسوخ ہے؟ یا مؤول ہے؟ یا وہ محکم ہے اور اپنے ظاہری معنیٰ پر محمول ہے؟ ابن الحاجب [ابوعمرو جمال الدین عثمان بن عمر، ۵۷۰-۶۴۶ھ] نے اپنی مختصر میں اور ان کے متبعین نے اسی قول کی طرف میلان ظاہر کیا ہے؛ لیکن اس قول کو رد کرتے ہوئے کہا گیا کہ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ حدیث کے بارے میں مذکورہ بالا احتمالات کی نفی کا

(۱) خزانۃ الروایات، فصل فی کیفیۃ الافتاء، حوالہ سابق۔

یقین اس شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا، تو ایسا یقین تو مجتہد شخص کو بھی حاصل نہیں ہوتا ہے، وہ اپنی بیشتر آراء کی بناء غالب ظن پر رکھتا ہے۔ اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مذکورہ امور کو ظن غالب کے طور پر بھی نہیں جانتا ہے، تو زیر بحث معاملہ میں ہم اس سے اتفاق نہیں کریں گے؛ اس لئے کہ متبحر فی المذہب شخص جو مذہب کی کتابوں سے واقف اور حدیث وفقہ کی ایک خاصی تعداد کا حافظ ہوتا ہے، اسے یہ غالب ظن حاصل ہو جاتا ہے کہ فلاں حدیث نہ تو منسوخ ہے، اور نہ اس میں ایسی تاویل ہے جس کو اختیار کرنا ضروری ہو۔ اور یہاں بحث ایسے ہی شخص کے بارے میں ہے جس کے اندر مذکورہ صلاحیت موجود ہے۔

[راجح قول]

اس مسئلہ میں تیسرا قول راجح ہے جسے ابن الصلاح [ابوعمرو عثمان بن عبد الرحمٰن، ۵۷۷-۶۴۳ھ] نے اختیار کیا ہے، اور جسے علامہ نووی نے تسلیم کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن الصلاح نے کہا:

"اگر کسی شافعی شخص کو کوئی ایسی حدیث ملے جو اس کے مسلک کے خلاف ہو تو اس وقت دیکھا جائے گا، اگر اس کے اندر مطلقاً اجتہاد کی صلاحیت موجود ہے، یا اس باب اور مسئلہ میں اجتہاد کی صلاحیت موجود ہے تو وہ حدیث پر عمل کرنے میں خود مختار ہوگا۔ اگر اس کے اندر اجتہاد کی صلاحیت مکمل نہیں ہے اور حدیث کے خلاف عمل کرنا اس پر شاق گزر رہا ہے، اور تلاش وجستجو کے بعد بھی اسے حدیث کے خلاف عمل کے بارے میں کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا، تو وہ اس وقت حدیث پر عمل کرسکتا ہے جب کہ امام شافعیؒ کے علاوہ کسی دوسرے مستقل امام نے اس پر عمل کیا ہو۔ اور اس صورت میں اپنے امام کے مسلک پر عمل نہ کرنے میں وہ معذور تصور کیا جائے گا۔ امام نووی نے اس رائے کی تحسین فرمائی ہے اور اسے اختیار فرمایا ہے۔"[1]

[۳] مسئلہ : [دوسرے مسلک کی تقلید]

متبحر فی المذہب شخص کسی مسئلہ میں اگر اپنے امام کے مسلک کے برخلاف کسی

(۱) ادب المفتی والمستفتی، صفحہ ۱۲۱، عالم الکتب ۱۹۸۶ء

دوسرے امام کی تقلید کرنا چاہے تو کیا یہ جائز ہے؟ اس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ امام غزالیؒ اور ایک گروہ علماء نے اس سے منع کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ رائے کمزور ہے؛ کیونکہ اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ دلیل پر عمل کرے، اور جب دلائل سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا تو اس کے امام کے افضل ہونے کے اعتقاد کو دلیل کے قائم مقام بنایا گیا۔ تو جس طرح شرعی دلیل کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح اپنے امام کے مسلک سے نکلنا جائز نہیں ہے۔

لیکن اس کو رد کرتے ہوئے کہا گیا کہ دوسرے تمام اماموں پر اپنے امام کے مطلقا افضل ہونے کا اعتقاد تقلید کے صحیح ہونے کے لئے متفقہ طور پر ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کہ صحابہ وتابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اس امت کے سب سے افضل شخص حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ ہیں؛ لیکن اس کے باوجود بہت سارے مسائل میں وہ حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کی رائے کے برخلاف دوسرے صحابہ کی تقلید کرتے تھے، اور اس پر کسی نے نکیر نہیں کی؛ لہذا یہ بات اجماعی ہوگئی۔ اور جہاں تک اس زیر بحث مسئلہ میں اپنے امام کے قول کی افضلیت کی بات ہے تو نرے مقلد کے لئے یہ بات جاننی ممکن نہیں ہے؛ لہذا یہ بات بھی تقلید کی شرط نہیں ہوگی، کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ جمہور مقلدین کی تقلید درست نہیں ہو۔ اور اگر بالفرض اس کو مان لیا جائے تو بھی زیر بحث مسئلہ میں یہ اس رائے کے حق میں نہیں بلکہ خلاف میں جاتی ہے، اس لئے کہ بیشتر اوقات اسے ایسی حدیث ملتی ہے جو اس کے امام کے مسلک کے خلاف ہے، یا ایسا قوی قیاس ملتا ہے جو اس کے مسلک کے خلاف ہے، تو اس مسئلہ میں وہ اپنے امام کے علاوہ کے لئے افضلیت کا اعتقاد رکھتا ہے۔

اور اکثر علماء کے نزدیک یہ درست ہے، ان میں آمدی [ابوالحسن سیف الدین علی بن محمد، ۵۵۱-۶۳۱ھ]، ابن الحاجب، ابن الہمام [کمال الدین محمد بن عبدالواحد، ۷۹۰-۸۶۱ھ] اور نووی اور ان کے متبعین جیسے ابن حجر [ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی، ۷۷۳-۸۵۲ھ] اور رملی [شمس الدین محمد بن احمد، ۹۱۹-۱۰۰۴ھ] اور حنابلہ و مالکیہ میں سے کئی جماعت وغیرہ اتنے علماء ہیں جن کے ناموں کا ذکر باعث طوالت ہوگا، مذاہب اربعہ کے متاخرین مفتیان کرام کا اسی پر اتفاق ہے، اور انھوں نے اوائل علماء کے کلام سے اس کا استخراج کیا ہے، اور اس

مسئلہ پر ان کے مستقل رسائل ہیں۔

[دوسرے مسلک کی تقلید کے لئے شرط]

البتہ اس کے جواز کی شرط میں ان کے درمیان اختلاف ہے:

[پہلا قول] کچھ علماء کہتے ہیں کہ جس مسئلہ میں تقلید کر چکا ہے اس میں اب بالاتفاق وہ رجوع نہیں کرے گا۔ ابن الہمام نے اس کی توضیح کرتے ہوئے کہا: یعنی جو عمل وہ کر چکا ہے؛ لیکن اس جملہ کے مفہوم میں شارحین مختلف ہیں۔ ایک مفہوم یہ بتایا گیا کہ مخصوص وہ عمل مراد ہے جسے وہ انجام دے چکا ہے؛ بایں طور کہ مثلاً وہ چھوٹی نماز کو مذہب سابق کے مطابق ہی قضا کرے گا۔ اور یہی صحیح مفہوم ہے جو تحقیق پر پورا اترتا ہے۔ اور ایک مفہوم یہ بتایا گیا کہ اس جنس کا عمل مراد ہے؛ لیکن اس کی تردید کی گئی کہ یہ مفہوم اجماعی نہیں ہے، بلکہ علماء سلف سے اکثر وبیشتر یہ مروی ہے کہ انھوں نے ان چیزوں میں مسلک کے خلاف عمل کیا جن میں وہ عمل کرتے آرہے تھے۔

[دوسرا قول] کچھ فقہاء کی رائے ہے کہ رخصتوں کو منتخب نہ کرتا جائے ، یعنی جو آسان لگے اسے اختیار کرلے؛ لیکن اس کی بھی تردید کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ کو تو جب بھی دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ آسان کو اختیار فرماتے تھے بشرطے کہ وہ گناہ نہ ہو۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ ایسی چیز کو اختیار نہ کرے جس کی دلیل قوی نہ ہو؛ بلکہ صریح وصحیح دلیل اس کے خلاف ہو، مثلاً متعہ اور بیع صرف۔ اور یہ رائے بہت باوزن ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب ''التلخیص فی تخریج احادیث الرافعی'' کے کتاب النکاح میں حاکم کی کتاب ''علوم الحدیث'' کے حوالہ سے منقول ہے کہ انھوں نے امام اوزاعی [عبدالرحمٰن بن عمرو بن محمد، ۸۸-۱۵۷ھ] تک اپنی سند کے ساتھ ان کا قول نقل کیا ہے کہ:

> ''اہل حجاز کے اقوال میں سے پانچ اقوال اور اہل عراق کے اقوال میں سے پانچ اقوال سے اجتناب کیا جائے گا، یا انھیں ترک کر دیا جائے گا۔ اہل حجاز کے وہ پانچ اقوال یہ ہیں: لہو ولعب کا سننا، متعہ، عورتوں کی پچھلی شرمگاہ میں مباشرت، بیع صرف اور بغیر کسی عذر کے دو نمازوں کے درمیان جمع۔ اور اہل عراق کے وہ پانچ اقوال ہیں:

نبیذ کا پینا، عصر کی نماز کا اتنا مؤخر کرنا کہ ہر چیز کا سایہ اس کا چار گنا ہو جائے، نماز جمعہ صرف سات شہروں میں ہے، میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا اور رمضان میں فجر کے بعد کھانا''۔

پھر ابن حجر کہتے ہیں:

''عبد الرزاق نے معمر سے روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص غناء کے سننے میں اور عورتوں سے ان کی پچھلی شرمگاہ میں مباشرت کرنے میں اہل مدینہ کے قول کو اختیار کرے، اور متعہ اور بیع صرف میں اہل مکہ کا قول اختیار کرے، اور نشہ آور چیزوں میں اہل کوفہ کا قول اختیار کرے تو وہ شخص سب سے بدترین بندہ خدا ہوگا۔''(۱)

[تیسرا قول] کچھ فقہاء کہتے ہیں کہ ایسی تلفیق نہ کرے کہ جس سے وقوع پذیر صورت دونوں اماموں کے نزدیک ممنوع قرار پائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ممنوع یہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں ممنوع صورت کا ارتکاب لازم آجائے، مثلاً بغیر ترتیب کے وضو کرے پھر جسم سے خون نکل کر بہہ جائے۔ اگر دو مسئلوں میں ایسا ہو تو یہ ممنوع نہیں ہے، مثال کے طور پر امام شافعیؒ کے مسلک پر کپڑے کو پاک کرے پھر امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر نماز پڑھے۔ لیکن یہ مسئلہ قابل غور ہے؛ کیونکہ اگر اس قید سے یہ مقصود ہے کہ عمل کی مجموعی صورت متفقہ دائرہ سے باہر نہ نکلے تو یہ بات دو مسئلوں میں بھی پائی جا رہی ہے۔ اور اگر مقصود یہ ہے کہ تنہا یہ مسئلہ اجماع کے دائرہ سے باہر نہ ہو تو اتنی شرط لگانا کافی ہے کہ وہ بھی ایسا مسلک ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش ہے، جیسا کہ تفصیل آرہی ہے۔

[چوتھا قول] کچھ فقہاء کہتے ہیں کہ جس دوسرے مسلک کو وہ اختیار کر رہا ہے وہ ایسا نہ ہو جس میں قاضی کا فیصلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ رائے بہت قوی ہے، اور ایسے مسلک سے احتراز اس وقت حاصل ہو جاتا ہے جب اختیار کیا جانے والا مسلک مشہور و مقبول مسالک اربعہ میں سے کوئی مسلک ہو۔

[پانچواں قول] اور بعض فقہاء نے کہا کہ اس مسئلہ میں اپنے امام کے علاوہ کی تقلید پر اسے انشراح قلب حاصل ہو، لیکن ایسا اطمینان تو صرف متبحر شخص کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱) تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر، ۲/۱۷۸، دار المعرفۃ بیروت

ایک قول یہ ہے کہ اگر اپنا مسلک چھوڑ کر ایسے قول کی اتباع کرے جو مشہور ہو اور جس پر اکثریت کا عمل ہو تو اس صورت میں اپنے مسلک سے نکلنا بہتر ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس صورت ہو تو اپنے مسلک کو چھوڑنا قبیح ہے۔

علماء کے رسائل میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا یہ اس کا خلاصہ اور تجزیہ ہے۔

[مصنف کی رائے]

میرے نزدیک دوسرے مسلک پر عمل کے لئے جواز کی شرط یہ ہوگی کہ اس کی وجہ سے قاضی کا فیصلہ نہ ٹوٹتا ہو، خواہ یہ ٹوٹنا اس لئے ہو کہ دو ایسے امور جمع ہو جارہے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر صحیح ہے، جیسے بغیر اکھٹے گواہان اور بغیر اعلان کے نکاح کیا جائے، یا اس کے علاوہ وجہ سے قاضی کا فیصلہ ٹوٹتا ہو۔ اور دوسرے مسلک پر عمل کے لئے اختیار کی شرط یہ ہوگی کہ اسے انشراح قلب حاصل ہو، خواہ یہ دلیل میں کسی قوت کی وجہ سے ہو، یا اس لئے ہو کہ سلف میں اس پر عمل کرنے والے کثرت سے رہے ہیں، یا اس میں زیادہ احتیاط ہو، یا اس کے ذریعہ کسی ایسی دشواری و تنگی سے نکلنے کا راستہ ملتا ہو جس تنگی میں رہ کر اطاعت ممکن نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: '' اذا امرتکم بشیء فاتوا منه بما استطعتم '' (۱) [جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو جس قدر تمہارے بس میں ہو اسے انجام دو]۔ یا اسی جیسے کسی ایسے سبب کی وجہ سے قلبی اطمینان ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے۔ صرف خواہش نفس اور دنیا طلبی کے لئے اطمینان قلب مراد نہیں ہے۔ اور دوسرے مسلک پر عمل واجب ہونے کی شرط یہ ہوگی کہ اس سے دوسرے کا حق متعلق ہو، تو قاضی اس کے مسلک کے خلاف فیصلہ کرے گا۔

'خزانۃ الروایات' میں 'کشف القناع' کے حوالہ سے ہے کہ:

> '' اگر کسی شخص نے کسی چیز میں ایک فقیہ کی تقلید کی تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ اس فقیہ کو چھوڑ کر دوسرے فقیہ کی تقلید کرے۔ اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ اس نے کسی ایک متعین مسلک جیسے امام ابوحنیفہ، امام شافعی وغیرہ کے مسلک کا التزام نہیں کیا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے کسی متعین مسلک کا التزام کر رکھا

---

(۱) بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ

ہو، اور کہتا ہو کہ میں ایک مسلک کا متبع اور التزام کرنے والا ہوں۔ پہلی صورت کے بارے میں ابن الحاجب کہتے ہیں کہ جس مسئلہ میں وہ تقلید کر چکا ہے اس میں وہ بالاتفاق رجوع نہیں کرے گا؛ البتہ دوسرے مسائل میں راجح یہ ہے کہ پہلے مسلک سے رجوع کرسکتا ہے؛ اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے "فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون "(۱) [پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو]۔ پس یہ کہنا کہ جس فقیہ کی تقلید پہلے کسی مسئلہ میں کر چکا ہے، اسی کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، حکم قرآنی کو مقید کرنا ہے، اور ایسی قید لگانا حکم کو منسوخ کرنے کے درجہ میں ہے، جیسا کہ اصول میں طے پا چکا ہے۔ اور اس لئے کہ خود نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ: "اصحابی كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم "(۲) [میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم ان میں سے جس کی اقتدا کروگے ہدایت پالوگے]۔ اسی لئے دور سلف میں عوام کا عمل یہ تھا کہ وہ کسی ایک فقیہ کی تعیین کئے بغیر جس سے چاہتے مسئلہ معلوم کرتے تھے، اور اس پر کوئی نکیر نہیں ہوتی تھی، تو اس طرز عمل کے جائز ہونے پر اجماع ہو چکا، جیسا کہ شرح ابن حاجب میں ہے۔ جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے جب کہ اس نے کسی ایک متعین مسلک مثلا مسلک ابوحنیفہ یا مسلک شافعی کا التزام کر رکھا ہو، تو اس صورت کے بارے میں ابن الحاجب نے اپنے مسلک کے اختلاف رائے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اپنے مسلک سے رجوع مطلقا جائز نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقا جائز ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی صورت اور اس صورت دونوں کا حکم یکساں ہے؛ لہذا جس مسئلہ میں تقلید یعنی اس کے مطابق عمل کر چکا ہے اس میں رجوع جائز نہیں ہے، دوسرے مسائل میں مسلک سے ہٹ کر تقلید کی جاسکتی ہے۔

'فتاویٰ صوفیہ' کے حوالہ سے 'عمدۃ الاحکام' میں ہے: عید الفطر کے دن کے بارے میں پوچھا گیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ زوال کے وقت جامع مسجد میں نفل پڑھتے ہیں،

---

(۱) سورہ نحل، آیت ۴۳

(۲) رواہ البیہقی، دیکھئے: کشف الخفاء للعجلونی ۱/ ۱۱۸، دار الکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۱ء

ہم انھیں اس سے منع کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تین اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔تو انھوں نے جواب دیا: منع کرنا درست نہیں ہے، تاکہ منع کرنے والا اس آیت کے تحت نہ آجائے کہ: '' أرأیت الذی ینھی عبدا اذا صلی ''(۱) [بھلا اسے بھی تو نے دیکھا جو بندے کو روکتا ہے؛ جبکہ وہ بندہ نماز ادا کرتا ہے]، اور زوال کے وقت کا یقین نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ وقت زوال سے پہلے یا اس کے بعد کا ہو۔اور اگر زوال کا وقت بھی ہو تب بھی امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت نفل پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔امام شافعیؒ سال بھر اسے مکروہ نہیں سمجھتے۔پس اگر تم اس نمازی پر اعتراض کرو گے تو ممکن ہے وہ یہ جواب دے کہ اس نے اس مسئلہ میں ایسے امام کی تقلید کی ہے جس کے نزدیک یہ جائز ہے۔یا وہ اسی دلیل سے تمہارے سامنے استدلال کرے جس سے اس رائے کو اختیار کرنے والے امام نے استدلال کیا ہے۔تو کسی مجتہد کی تقلید کرنے یا کسی دلیل سے استدلال کرنے والے شخص پر تم کیسے نکیر کر سکتے ہو۔

اسی کتاب میں 'التجنیس والمزید' کے حوالہ سے ہے کہ بسا اوقات اس مصلی نے اس مجتہد کی تقلید کی، تو کسی اجتہادی عمل کو کرنے یا کسی مجتہد کی تقلید کرنے والے پر نکیر کیسے کی جا سکتی ہے۔

'ظہیریہ' میں ہے: اگر کسی شخص نے اجتہادی مسئلہ میں کوئی عمل کیا یا اس میں کسی مجتہد کی تقلید کی تو اس پر نہ کوئی عار ہے نہ شناعت اور نہ وہ کسی نکیر کا مستحق ہے۔''(۲)

بیضاوی کی 'المنہاج' میں ہے:

'' اگر شوہر ایک لفظ (طلاق) کو کنایہ سمجھتا ہے، اور بیوی اس کو صریح سمجھتی ہے تو شوہر کو مطالبہ کا حق ہے اور بیوی کو اجتناب کا حق ہے۔لہٰذا دونوں کسی تیسرے شخص کی طرف رجوع کریں گے''۔(۳)

---

(۱) سورہ علق، آیت ۹، ۱۰

(۲) خزانۃ الروایات، فصل فی کیفیۃ الافتاء، حوالہ سابق۔

(۳) شرح المنہاج للبیضاوی، للاصفہانی، ۲/ ۸۴۲، مکتبۃ الرشد ریاض ۱۹۹۹ء

فائدہ: [کتاب الانوار کی دو عبارتوں میں تضاد کا حل]

ایک شافعی شخص کو کتاب 'الانوار' [لعمل الابرار للامام جمال الدین یوسف بن ابراہیم اردبیلی، متوفی ۷۹۹ھ] کی دو عبارتوں کے درمیان اشکال ہوا، تو میں نے اس کو ایسا جواب دیا جس سے اشکال ختم ہوگیا۔

وہ یوں ہے کہ 'الانوار' کی کتاب القضاء کی ایک عبارت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ مسالک مدون ہوگئے تو اب مقلد کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک مجتہد کے مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسی طرح اگر بعض مسائل میں ایک مجتہد کی تقلید کی، اور دوسرے مسائل میں دوسرے مجتہد کی تقلید کی، یہاں تک کہ ہر مسلک میں سے جو آسان ہے اسے اختیار کرلیا، مثلاً حنفی شخص نے فصد کھلوایا، اور چاہا کہ امام شافعی کے مسلک پر عمل کرلے تاکہ وضو نہ کرنا پڑے، یا شافعی شخص نے اپنی شرمگاہ کو یا کسی عورت کو مس کیا (چھولیا) اور چاہا کہ حنفی مسلک پر عمل کرلے تاکہ وضو نہ کرنا پڑے وغیرہ، تو ایسا کرنا جائز ہے۔ یہ 'الانوار' کی کتاب القضاء کی بحث کا خلاصہ ہے۔

اور باب الاحتساب کے اندر مصنف نے لکھا: اگر کسی شافعی نے ایک شافعی شخص کو دیکھا کہ وہ نبیذ پی رہا ہے، یا بغیر ولی نکاح کرکے اس سے وطی کررہا ہے، تو وہ اس پر نکیر کرے گا، اس لئے کہ ہر مقلد پر اپنے امام کی اتباع لازم ہے، اور اس کی مخالفت سے وہ گنہ گار ہوگا۔ اور اگر کسی شافعی نے ایک حنفی شخص کو دیکھا کہ وہ گوہ کو کھا رہا ہے، یا ایسے ذبیحہ کو کھا رہا ہے جس پر جان بوجھ کر بسم اللہ نہیں کہا گیا تھا، تو وہ اس سے کہے گا کہ یا تو تم یہ اعتقاد رکھو کہ امام شافعی اتباع کے زیادہ مستحق ہیں، یا اپنے اس طرز عمل کو چھوڑو۔ یہ بات باب الاحتساب میں کہی گئی ہے۔ ان دونوں باتوں کے اندر تضاد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس تضاد کا حل میرے نزدیک یہ ہے۔ اور اللہ بہتر جانتا ہے۔ کہ مصنف کے اس جملہ کہ 'وہ مخالفت کی وجہ سے گنہ گار ہوگا' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے امام کی مخالفت کی وجہ سے وہ گنہ گار اس وقت ہوگا جب اس نے تمام مسائل میں یا صرف اسی مسئلہ میں اپنے امام کی تقلید کا عزم کیا ہو پھر اس کی مخالفت پر آمادہ ہوا ہو تو یہ بلاشبہ معصیت ہے۔ لیکن اگر وہ اس

مسئلہ میں دوسرے امام ہی کی تقلید کرتا ہے تو یہ دوسرا ہی اس کا امام ہے، اور اس نے اس امام کی مخالفت نہیں کی۔ یا ہم یوں جواب دیتے ہیں کہ دوسرا (باب الاحتساب والا مسئلہ) امام غزالیؒ اور ایک گروہ علماء کے قول پر مبنی ہے، اور پہلا مسئلہ جمہور کے قول پر مبنی ہے۔ اس طرح یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ اس حل میں بعض مصنفین کو بڑی دشواری پیش آئی ہے۔

[۴] مسئلہ: [واجب تقلید اور حرام تقلید]

مجتہد کی تقلید کی دو قسمیں ہیں: تقلید واجب اور تقلید حرام۔ اول قسم یہ ہے کہ تقلید روایت کی دلالتاً اتباع کے طور پر ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کتاب وسنت سے ناواقف انسان بذات خود دلائل کی تلاش نہیں کر سکتا ہے اور نہ دلائل سے احکام معلوم کر سکتا ہے، لہٰذا اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کسی فقیہ سے پوچھے کہ فلاں فلاں مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ نے کیا حکم فرمایا ہے۔ جب اسے بتایا جائے تو وہ اس کی اتباع کرے، خواہ وہ حکم کسی حدیث صریح سے ماخوذ ہو، یا کسی نص سے حکم کا استنباط کیا گیا ہو، یا کسی منصوص مسئلہ پر قیاس کیا گیا ہو۔ یہ تمام صورتیں رسول اللہ ﷺ سے روایت میں داخل ہیں، خواہ دلالتاً داخل ہوں۔ اس قسم کی تقلید کے صحیح ہونے پر تمام امت کا ہر ہر صدی میں اتفاق رہا ہے؛ بلکہ تمام اقوام اپنی اپنی شریعتوں میں اس قسم کی تقلید کے درست ہونے پر متفق رہی ہیں۔ اس قسم کی تقلید کی پہچان یہ ہے کہ مجتہد کے قول پر اس کا عمل اس بات کے ساتھ مشروط رہتا ہے کہ مجتہد کا قول قرآن اور حدیث کے مطابق ہے؛ اسی لئے وہ ہمیشہ بقدر امکان سنت کا متلاشی رہتا ہے۔ اور جب بھی کوئی حدیث قول مجتہد کے خلاف ظاہر ہوتی ہے تو وہ حدیث کو اختیار کر لیتا ہے۔ ائمہ مجتہدین نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: جب صحیح حدیث ملے تو وہی میرا مذہب ہے۔ اور جب تم دیکھو کہ میرا کلام حدیث کے خلاف ہے تو حدیث پر عمل کرو، اور میرے کلام کو دیوار پر مار دو۔ امام مالکؒ نے فرمایا: ہر انسان کا کلام ایسا ہے جو قابل قبول بھی ہو سکتا ہے اور اسے رد بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن صرف رسول اللہ ﷺ کا قول واجب الاتباع ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: جس شخص کو میری دلیل نہ معلوم ہو اسے میرے کلام پر فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ اور امام احمدؒ نے فرمایا: نہ میری تقلید کرو، اور نہ امام مالک یا کسی اور کی تقلید کرو؛ بلکہ احکام وہیں سے معلوم کرو جہاں سے ان لوگوں نے معلوم کیا

ہے۔یعنی قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ سے۔

حرام تقلید یہ ہے کہ کسی فقیہ کے بارے میں یہ گمان رکھا جائے کہ وہ انتہائی مقام کو پہنچ گیا ہے، کہ اب اس سے خطا کا امکان باقی نہیں ہے؛ لہذا جب بھی اس مقلد کے پاس کوئی حدیث پہنچے، جو صحیح بھی ہو اور صریح بھی اور اس فقیہ کے قول کے خلاف ہو تو وہ فقیہ کا قول ترک نہیں کرے گا۔ یا یہ خیال کرے کہ جب میں نے اس فقیہ کی تقلید کر لی تو اب اللہ نے مجھے اسی فقیہ کی بات ماننے کا مکلّف بنایا ہے، اور وہ خود اس سفیہ (بے عقل) کی طرح ہو گیا ہے جس پر قانوناً پابندی عائد ہوتی ہے؛ لہٰذا جب اس تک کوئی حدیث پہنچے اور اس کو یقین ہو جائے کہ حدیث صحیح ہے تب بھی وہ اس حدیث کو قبول نہیں کرے گا؛ اس لئے کہ وہ تقلید کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال چکا ہے۔

یہ خیال فاسد ہے اور یہ رائے بالکل کھوٹی ہے، اس کی تائید نہ کسی شرعی دلیل سے ہوتی ہے اور نہ عقل اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ ابتدائی صدیوں میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ملے گا جو ایسا خیال رکھتا ہو۔ جو انسان غلطی سے معصوم نہیں ہے، اس کے بارے میں یہ گمان رکھنا بالکل جھوٹ ہے کہ وہ حقیقتاً معصوم ہے، یا اس کے قول پر عمل کے حق میں وہ معصوم ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اس گمان میں جھوٹا ہے کہ اللہ تعالی نے اسی فقیہ کی بات ماننے کا اس کو مکلّف بنایا ہے اور اب تقلید کا قلادہ اس کی گردن میں پڑ چکا ہے۔ ایسے ہی شخص کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: ''وانا علی آثارھم مقتدون ''[1] (اور ہم ان کے قدموں کے نقشوں کے پیچھے چلنے والے ہیں)۔ اور سابقہ اقوام کی تحریفات اسی قسم کی تھیں۔

[۵] مسئلہ : [شاذ روایات پر فتویٰ]

شاذ اور متروک روایات پر فتویٰ دینے کے مسئلہ میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

'خزانۃ الروایات' میں 'سراجیہ' کے حوالہ سے ہے:

''فتویٰ علی الاطلاق امام ابوحنیفہ کے قول پر ہوگا، پھر امام ابو یوسف کے قول پر، پھر امام محمد بن حسن شیبانی کے قول پر، پھر زفر بن ہذیل اور حسن بن زیاد کے قول پر فتویٰ ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں ایک طرف امام ابوحنیفہ ہوں اور دوسری

(۱) سورہ زخرف ۲۳۔

جانب صاحبین ہوں تو مفتی کو اختیار ہوگا۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، جب کہ مفتی مجتہد نہ ہو؛ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے، حتی کہ امام شافعیؒ نے فرمایا: تمام فقہاء فقہ میں امام ابوحنیفہ کے عیال ہیں۔

المضمرات میں ہے: کہا گیا کہ اگر امام ابوحنیفہ ایک جانب ہوں اور دوسری جانب امام ابو یوسف اور امام محمد ہوں تو مفتی کو اختیار ہوگا، چاہے تو امام ابوحنیفہ کا قول اختیار کرے اور چاہے تو صاحبین کا قول اختیار کرے؛ لیکن اگر صاحبین میں سے کوئی ایک امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہو تو مفتی ان ہی دونوں کا قول لازماً اختیار کرے گا، سوائے اس کے کہ مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہو کہ صاحبین میں سے جو تنہا ہیں ان کا قول اختیار کیا جائے، تو پھر مشائخ کے اتفاق کی اتباع کی جائے گی۔ جیسے نماز میں مریض کے بیٹھنے کے مسئلہ میں فقیہ ابو اللیث نے امام زفر کا قول اختیار کیا کہ مریض نماز میں اس طرح بیٹھے گا جس طرح نمازی تشہد کی حالت میں بیٹھتا ہے؛ اس لئے کہ یہ نشست مریض کے لئے زیادہ آرام دہ ہے؛ حالانکہ ہمارے اصحاب کا قول یہ ہے کہ مریض شخص حالت قیام میں چارزانو ہوکر یا گوٹ مار کر بیٹھے گا؛ تا کہ حالت قعود اور حالت قیام کے بیٹھنے میں فرق ہوجائے؛ لیکن یہ کیفیت مریض کے لئے باعث مشقت ہے؛ اس لئے کہ وہ قعدہ والی نشست کا عادی ہوتا ہے۔

اسی طرح مشائخ نے امام زفر کی رائے اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو شخص بغیر اجازت بادشاہ کے پاس چغل خوری کرے وہ ضامن ہوگا۔ یہ رائے اس لئے اختیار کی تا کہ چغل خوری کا دروازہ بند ہو سکے۔ اگر چہ ہمارے اصحاب کا قول یہ ہے کہ ضمان واجب نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ اس نے اس کا مال تلف نہیں کیا ہے۔ اور مشائخ کے لئے جائز ہے کہ وہ زمانہ کی مصلحت کے پیش نظر اپنے اصحاب میں سے کسی ایک کا قول اختیار کریں۔

'القنیہ' میں 'باب ما یتعلق بالمفتی' کے اندر 'نوادر' کے حوالہ سے ہے، وہ فرماتے ہیں: قضاء سے متعلق مسائل میں فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہوگا؛ کیونکہ امام ابو یوسف کو قضاء کا زیادہ تجربہ ہے۔ المضمرات میں ہے: مفتی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ

کسی منفعت کی خاطر بعض متروک اقوال پر فتویٰ دے، اس لئے کہ اس کا ضرر دنیا اور آخرت میں بہت بڑا اور وسیع ہے؛ بلکہ وہ مشائخ کے اقوال اور ان کے اختیارات کو اختیار کرے گا، سلف کی سیرت کی اتباع کرے گا، اور فضیلت وشرف کو حاصل کرنے پر اکتفاء کرے گا۔'' (۱)

'القنیہ' میں 'کتاب ادب القاضی' کے اندر مسائل متفرقہ کے باب میں ہے:

''جو مسائل قضاء سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہوگا؛ اس لئے کہ انھیں قضاء کا تجربہ زیادہ رہا۔'' (۲)

'عمدۃ الاحکام' میں 'کشف البزدوی' کے حوالہ سے ہے:

''مفتی کے لئے مستحب ہے کہ عوام کی آسانی کے لئے رخصتوں کو اختیار کرے، جیسے حمام کے پانی سے وضو، پاک مقامات پر بغیر مصلیٰ کے نماز، ایسی جگہ پر راستہ کے کیچڑ سے نہ بچنا جہاں کیچڑ کی پاکی کا علماء نے حکم دیا ہو۔ لیکن یہ آسانی ان لوگوں کے لئے نہیں ہوگی جو کنارہ کش رہتے ہیں۔ ان کے لئے احتیاط کو اختیار کرنا اور عزیمت پر عمل کرنا اولیٰ ہے۔

'القنیہ' میں ہے: پھر مفتی کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو ایسا فتویٰ دے جو ان کے لئے آسان ہو۔ بزدوی نے شرح الجامع الصغیر میں ایسا ہی ذکر کیا ہے: مفتی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کے حق میں اور بالخصوص کمزوروں کے حق میں زیادہ آسان کو اختیار کرے؛ اس لئے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت ارشاد فرمایا تھا: ''یسرا و لا تعسرا'' (۳) [تم دونوں آسانی پیدا کرنا، تنگی نہ پیدا کرنا۔]

'عمدۃ الاحکام' کے کتاب الکراھیہ میں ہے: کتا اور خنزیر کا جھوٹا نجس ہے، بر خلاف امام مالک وغیرہ کے۔ اور اگر کوئی امام مالک کے قول پر فتویٰ دے تو جائز ہے۔ القنیہ

(۱) خزانۃ الروایات، فصل فی کیفیۃ الافتاء، حوالہ سابق۔
(۲) القنیۃ المنیۃ لتتمیم الغنیۃ، باب مسائل متفرقہ، حوالہ سابق۔
(۳) بخاری، کتاب الجہاد والسیر

میں ہے: ایک فقیہ حضرت سعید بن المسیب [۱۳-۹۴ھ] کے مذہب پر فتویٰ دیتا ہے، اور تین طلاق والی عورت کا نکاح پہلے شوہر سے کر دیتا ہے تو وہ عورت تین طلاق والی ہی رہے گی جیسی تھی، اور فقیہ کو سزا دی جائے گی۔ اور ایک فقیہ تین طلاق کے مسئلہ میں حیلہ اپناتا ہے اور رشوت لے کر ایسی عورت کا دوسرے شوہر کے ساتھ جنسی تعلق قائم ہوئے بغیر پہلے شوہر سے نکاح کر دیتا ہے تو کیا یہ نکاح صحیح ہوگا؟ اور ایسا کرنے والے کی سزا کیا ہوگی؟ فقہاء کہتے ہیں: ایسے شخص کا منہ کالا کر کے شہر بدر کر دیا جائے گا۔ 'فتاویٰ اعتمادیہ' میں 'فتاویٰ سمرقندی' کے حوالہ سے ہے کہ حضرت سعید بن المسیب نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا کہ تین طلاق والی عورت کے پہلے شوہر کے حق میں حلال ہونے کے لئے دوسرے شوہر کے ساتھ جنسی تعلق شرط نہیں ہے، لہذا اگر کوئی قاضی اس قول پر فیصلہ دے تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی فقیہ یہ فتویٰ دے تو وہ درست نہیں ہوگا اور اس فقیہ کی تعزیر کی جائے گی۔''(۱)

'المنہاج' کی شرح 'التحفہ' میں ہے:

''عراقی نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ مقلد کو اپنے امام کے دو قول کے درمیان اختیار ہوگا، یعنی بطور بدل کے، بطور جمع کے نہیں؛ بشرطیکہ دونوں اقوال میں سے کسی ایک قول کی ترجیح ظاہر نہ ہو۔ شاید ان کی مراد ان کے مذہب کے ائمہ کا اجماع ہے، کیونکہ ہمارے مذہب کا تقاضہ یہ ہے جیسا کہ سبکی نے کہا ہے کہ قضاء اور فتویٰ دونوں میں یہ درست نہیں ہے، البتہ خود اس پر عمل کرنے میں درست ہے۔ اس طرح (درج ذیل دو اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے، یعنی) امام ماوردی کے اس قول کہ 'ہمارے نزدیک یہ جائز ہے، اور امام غزالیؒ نے اس کی تائید کی ہے. جس طرح یہ جائز ہے کہ جس شخص کا اجتہاد دو جہتوں کو یکساں درجہ میں قبلہ تصور کرتا ہو، وہ بالاتفاق دونوں جہتوں میں سے جدھر چاہے نماز پڑھ لے'۔ اور امام کے اس قول کہ 'اگر دونوں اقوال دو متضاد احکام رکھتے ہوں جیسے واجب ہونا اور حرام ہونا، تو اس میں دونوں میں اختیار ممنوع ہوگا؛ لیکن کفارہ کے اختیاری امور جیسے احکام ہوں تو اختیار ہوگا'، ان دونوں اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ علامہ سبکی نے یہی تطبیق دی ہے۔ اور مذاہب

---

(۱) خزانۃ الروایات، فصل فی کیفیۃ الافتاء، حوالہ سابق۔

اربعہ کے خلاف عمل کرنے میں علماء نے سبکی سے اتفاق کیا ہے۔ یعنی ان مذاہب پر عمل میں جن کی نسبت ایسے مجتہدین کی طرف ہو جن کی تقلید جائز ہے اور اجتہاد کی تمام شرطیں ان کے اندر موجود ہوں۔ ابن الصلاح کے اس جملہ کو بھی اسی پر محمول کیا گیا ہے کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ کی تقلید جائز نہیں ہے؛ یعنی قضاء اور فتویٰ میں جائز نہیں ہے۔ یہ اور اس کے علاوہ تقلید کی دیگر صورتوں کا محل وہ ہے جب رخصتوں کی تلاش اس طور پر نہ کرے کہ تقلید کے بندھن سے ہی آزاد ہو جائے؛ کیوں کہ ایسا ہونے کی صورت میں وہ گنہ گار ہوگا، بلکہ کہا گیا ہے کہ وہ فاسق ہو جائے گا، اور یہ باوزن قول ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اگر مدونہ مذاہب میں رخصتوں کو تلاش کرے تب مذکورہ بات ہے ورنہ قطعی طور پر فاسق ہوگا''۔

[چوتھی] فصل: عامی شخص

معلوم ہونا چاہئے کہ عامی انسان کا کوئی مسلک نہیں ہوتا ہے، اس کا مسلک مفتی کا فتویٰ ہے۔

'البحر الرائق' میں ہے:

''اگر کسی نے پچھنا لگایا یا غیبت کی اور یہ گمان کیا کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، پھر اس نے کھا لیا تو اگر اس نے کسی فقیہ سے فتویٰ نہ لیا ہو اور نہ ہی اسے حدیث معلوم ہو تو اس پر کفارہ واجب ہوگا؛ اس لئے کہ یہ محض ناواقفیت ہے، اور ناواقفیت دار الاسلام کے اندر عذر نہیں ہے؛ لیکن اگر اس نے کسی فقیہ سے فتویٰ لیا، اور مفتی نے اسے فتویٰ دیا تو اس پر کفارہ نہیں ہے؛ اس لئے کہ عامی شخص پر ایسے عالم کی تقلید واجب ہے جس کے فتویٰ پر وہ اعتماد کرتا ہو؛ لہٰذا وہ اپنے عمل میں معذور سمجھا جائے گا؛ اگر چہ فتویٰ دینے میں مفتی سے غلطی ہوئی ہو۔ اور اگر اس نے کسی فقیہ سے فتویٰ نہیں لیا؛ لیکن اسے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث معلوم ہوئی کہ '' أفطر الحاجم والمحجوم ''(۱) [پچھنا لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کے روزے ٹوٹ گئے] اور یہ حدیث کہ '' الغيبة تفطر الصائم '' (غیبت روزہ توڑ دیتی ہے)، اور اسے نہ تو حدیث کا

---

(۱) ترمذی، کتاب الصوم

منسوخ ہونا معلوم ہے اور نہ حدیث کی تاویل و مفہوم سے واقفیت ہے، تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس پر کفارہ نہیں ہے؛ اس لئے کہ ظاہر حدیث واجب العمل ہے۔ لیکن امام ابو یوسف کا اس سے اختلاف ہے، ان کی رائے ہے کہ عامی انسان کے لئے حدیث پر عمل کی اجازت نہیں ہے؛ کیونکہ اسے ناسخ اور منسوخ کا علم نہیں ہے۔ اگر کسی عامی انسان نے کسی عورت کو چھولیا یا شہوت کے ساتھ اس کا بوسہ لے لیا یا سرمہ لگالیا اور یہ گمان کیا کہ ان چیزوں کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، پھر اس نے روزہ توڑ لیا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، سوائے اس کے کہ اس نے کسی فقیہ سے فتویٰ پوچھا ہو اور فقیہ نے روزہ ٹوٹ جانے کا فتویٰ دیا ہو، یا اسے اس مفہوم کی حدیث معلوم ہوئی ہو۔ اور اگر اس نے زوال سے پہلے روزہ کی نیت کی، پھر روزہ توڑ دیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا؛ لیکن صاحبین کے نزدیک کفارہ لازم ہوگا۔ ایسا ہی المحیط میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عامی انسان کا مسلک اس کے مفتی کا فتویٰ ہے۔"(۱)

'البحر الرائق' میں ہی باب قضاء الفوائت میں (اس بحث میں کہ 'وقت کی تنگی اور بھول کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے') ہے کہ:

"... اگر وہ عامی شخص ہو جس کا کوئی معین مسلک نہیں ہے، تو اس کا مسلک اس کے مفتی کا فتویٰ ہے، جیسا کہ فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔ پس اگر کسی حنفی نے فتویٰ دیا تو وہ عصر اور مغرب کو دوہرائے گا۔ اور اگر کسی شافعی نے فتویٰ دیا تو وہ ان دونوں نمازوں کو نہیں دوہرائے گا۔ خود اس عامی کی رائے کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے کسی سے فتویٰ نہیں پوچھا اور اتفاق یہ رہا کہ کسی مجتہد کے مسلک کے مطابق اس کا عمل صحیح ہو گیا تو یہ کافی ہو جائے گا۔ اور اس پر دوہرانا لازم نہیں رہے گا۔"(۲)

ابن الکاملیہ [ابو عبد اللہ کمال الدین محمد بن عبد الرحمٰن، ۸۰۸۔ ۸۷۴ھ] کی 'شرح منہاج البیضاوی' میں ہے:

"اگر کسی عامی کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا، اور اس نے کسی مجتہد سے اس بارے میں

---

(۱) البحر الرائق، کتاب الصوم، فصل فی العوارض
(۲) البحر الرائق، باب قضاء الفوائت

فتویٰ پوچھا، اور اس مجتہد کے فتویٰ پر اس واقعہ میں عمل کر لیا تو بعینہ اسی واقعہ میں دوسرے مجتہد کے فتویٰ کی طرف رجوع کرنا بالاتفاق ناجائز ہوگا، جیسا کہ ابن الحاجب وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ جمع الجوامع میں ہے: اس میں اختلاف ہے۔ اور اگر اس نے عمل نہ کیا ہو تو نووی نے کہا: راجح یہ ہے، جسے خطیب وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اگر وہاں کوئی دوسرا مفتی نہ ہو تو اس مفتی کے فتویٰ دینے سے ہی وہ اس پر لازم ہو جائے گا، خواہ اس کا دل مطمئن نہ ہو۔ لیکن اگر وہاں دوسرا مفتی ہو تو محض پہلا فتویٰ دینے سے وہ اس پر لازم نہیں ہوگا، کیونکہ وہ دوسرے مفتی سے مسئلہ پوچھ سکتا ہے، اور دوسرا فتویٰ پہلے کے خلاف ہو سکتا ہے، تو اس میں دو مفتیوں کے فرق کا اختلاف جاری ہوگا۔

اگر اس عامی کے ساتھ پہلے واقعہ سے ہٹ کر کوئی دوسرا واقعہ پیش آیا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ دوسرے مفتی سے فتویٰ پوچھے، اور اس مفتی سے نہ پوچھے جس سے پہلے مسئلہ میں پوچھا تھا۔ کیاہراسی [شمس الاسلام عماد الدین علی بن محمد، ۴۵۰-۵۰۴ھ] نے قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ عامی پر واجب ہے کہ وہ ایک متعین مسلک کی پابندی کرے۔ جمع الجوامع میں ہے کہ ایسا کرنا عامی پر واجب ہے۔ لیکن محض خواہش نفس کے لئے وہ ایسا نہیں کرے گا؛ بلکہ وہ ایک معین مسلک کو اختیار کر کے اسی کی تقلید ہر اس چیز میں کرے گا جسے وہ دوسرے مسلک سے راجح یا اس کے مساوی سمجھے، نا کہ مرجوح۔ نووی نے کہا: دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ عامی شخص پر ایک ہی مسلک کو اپنانا لازم نہیں ہے؛ بلکہ وہ رخصتوں کو تلاش کئے بغیر جس سے چاہے فتویٰ معلوم کر سکتا ہے۔ اور غالباً جن فقہاء نے اس سے منع کیا ہے وہ اسی لئے کہ عامی کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہے کہ وہ رخصتوں کو تلاش نہیں کرے گا۔ اور عامی شخص اگر ایک معین مسلک کی پابندی کرے تو اس مسلک سے نکلنا اصح قول کے مطابق جائز ہے۔"(۱)

ابن رسلان [ابو العباس شہاب الدین احمد بن حسین، ۷۷۳-۸۴۴ کی 'کتاب الزبد' میں ہے:

"امام شافعی، امام مالک، امام نعمان امام احمد بن حنبل اور سفیان

(۱) تیسیر الوصول الی منہاج الاصول من المعقول والمنقول، ۶/ ۳۴۳-۳۴۶، قاہرہ ۲۰۰۲ء

اور تمام ائمہ ہدایت پر ہیں اور اختلاف رحمت ہے"[1]

اور اس کی شرح 'غایۃ البیان' میں ہے:

"اگر دو مساوی درجہ کے مجتہدین کے جوابات مختلف ہوں تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مقلد کو اختیار ہوگا کہ وہ ان دونوں میں سے جس کا قول چاہے اختیار کرے"۔

اور اس مسئلہ کے سلسلہ میں 'التحفہ' کتاب کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

(۱) متن الزبد (فقہ کی منظوم کتاب)، مقدمہ فی علم الاصول

باب [پنجم]

[متوازن موقف، معتدل روش]

یہ جو درمیانی بات ہم نے ذکر کی ہے، مسالک اربعہ کو اختیار کرنے والے جمہور علماء اسی کے قائل ہیں، اور ائمہ مسالک نے اپنے اصحاب کو اسی کی وصیت کی ہے۔

[مسلکی پابندی کے بغیر اتباع]

شیخ عبدالوہاب شعرانی [۸۹۸-۹۷۳ھ] نے 'الیواقیت والجواھر' میں لکھا ہے:

> ''امام ابوحنیفہ سے مروی ہے وہ فرماتے تھے کہ جس شخص کو میری دلیل نہ معلوم ہو، اسے میرے کلام پر فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ وہ جب فتویٰ دیتے تو فرماتے: یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے (اپنی ذات مراد ہے) یہ وہ سب سے بہتر رائے ہے جہاں تک ہم پہنچ سکے ہیں۔ جو شخص اس سے بھی بہتر رائے لائے تو وہ زیادہ درست ہے۔ امام مالک فرماتے تھے: ہر شخص کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی کی جاسکتی ہے، صرف رسول اللہ ﷺ کی بات واجب الاتباع ہے۔ حاکم اور بیہقی نے امام شافعیؒ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے تھے: جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب تم دیکھو کہ میرا قول حدیث کے خلاف ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو دیوار پر مار دو۔ ایک دن اپنے شاگرد امام مزنی سے فرمایا: اے ابراہیم! ہر بات میں میری تقلید مت کرو، بلکہ اس میں اپنے لئے خود دیکھ لو؛ اس لئے کہ یہ دین کا معاملہ ہے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے: رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کا قول حجت نہیں ہے، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ ہوں، نہ کسی کا قیاس حجت ہے اور نہ کچھ اور۔ صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تسلیم شدہ ہیں۔

امام احمد فرماتے تھے: اللہ اور اس کے رسول کے سامنے کسی دوسرے کا کلام معتبر نہیں ہے۔ آپ نے ایک شخص سے فرمایا: میری تقلید مت کرو، نہ مالک کی تقلید کرو، نہ اوزاعی کی تقلید کرو، نہ نخعی کی تقلید کرو، نہ کسی اور کی تقلید کرو۔ احکام وہیں سے حاصل کرو جہاں سے انھوں نے حاصل کیا تھا۔ یعنی قرآن اور سنت سے حاصل کرو''۔

پھر امام شعرانی نے علماء مذاہب کی ایک بہت بڑی جماعت سے یہ نقل کیا کہ وہ ایک معین مسلک کی پابندی کے بغیر مسالک پر عمل کرتے اور اس کے مطابق فتویٰ دیتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ ان اصحاب مسالک کے زمانہ سے امام شعرانی کے زمانہ تک جاری رہا ہے۔ امام شعرانی کے کلام سے یہ مطلب ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امر علماء کے یہاں قدیم وجدید ہر دور میں اس طرح معمول بہ رہا کہ اب وہ ایک متفقہ امر ہوگیا، اور وہی مسلمانوں کا ایسا راستہ قرار پاگیا جس کی مخالفت درست نہیں ہے۔ امام شعرانی کی اس توضیح اور تفصیل کے بعد اب اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں اقوال نقل کئے جائیں۔ لیکن سر دست جو اقوال ذہن میں محفوظ ہیں انھیں ذکر کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام بغوی نے 'شرح السنہ' کے آغاز میں لکھا ہے:

''میں اپنے نقل کردہ بیشتر مسائل میں بلکہ عام طور پر مسائل میں اتباع ہی کرتا ہوں، سوائے ان چند مسائل کے جن میں کسی کلام کی ایسی تاویل جس کا احتمال ہو، کسی مشکل کی توضیح یا ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کی بابت کوئی دلیل میرے سامنے واضح ہوجاتی ہے۔''(۱)

اور آغاز نماز کی دعاء کے باب میں 'انی وجهت' اور 'سبحانک اللهم' کے بعد لکھا ہے:

''آغاز نماز کے لئے اس کے علاوہ بھی دعائیں روایت کی گئی ہیں۔ پس یہ مباح اختلاف ہے، لہٰذا جس دعا سے بھی نماز شروع کی جائے جائز ہے۔''(۲)

اور 'باب المرأة لا تخرج الا مع محرم' میں لکھا ہے:

---

(۱) شرح السنہ، ۱/۲، مکتب اسلامی بیروت ۱۹۸۳ء

(۲) شرح السنہ، ۳/۳۹، مکتب اسلامی بیروت ۱۹۸۳ء

''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت کو ایسا محرم شخص دستیاب نہ ہو جو اس کے ساتھ حج کے لئے جا سکے، تو اس عورت پر حج لازم نہیں رہتا ہے۔ یہ نخعی اور حسن بصری کا قول ہے، یہی رائے ثوری، احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کی ہے۔ اور کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ایسی خاتون پر لازم ہوگا کہ وہ عورتوں کی جماعت کے ساتھ حج کے سفر پر نکلے۔ یہ رائے مالک اور شافعی کی ہے۔ اور حدیث کے ظاہر کی رو سے پہلی رائے زیادہ مناسب ہے۔''(۱)

امام بغوی نے بروع بنت واشق کی حدیث کے بارے میں کہا:

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر بروع بنت واشق کی حدیث ثابت ہوتی تو نبی ﷺ کے مقابلہ کسی کے قول میں حجت نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ معقل بن یسار سے مروی ہے، اور ایک مرتبہ کہا: معقل بن سنان سے مروی ہے، اور کبھی کسی اشجع کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ اور اگر یہ حدیث ثابت نہیں ہے تو عورت کے لئے نہ مہر ہے اور نہ میراث۔''(۲)

اور حاکم نے امام شافعیؒ کے اس قول کہ 'اگر بروع بنت واشق کی حدیث ثابت ہو تو میں وہی کہوں گا' کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''ان کے بعض مشائخ نے کہا کہ اگر میں شافعی کے پاس ہوتا تو ان کے تمام اصحاب کے سامنے کھڑے ہو کر کہتا کہ یہ حدیث ثابت ہوگئی ہے تو آپ اسی قول کو اختیار کیجئے۔''(۳)

اسی طرح امام شافعیؒ نے اوقات نماز کی بابت بریدہ اسلمیؓ کی حدیث کے سلسلہ میں بھی توقف اختیار کیا، جب کہ امام مسلم کے نزدیک حدیث صحیح ثابت ہوئی تو محدثین کی جماعات نے رجوع کرلیا۔ اسی طرح معصفر (زرد رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے) کے مسئلہ میں بیہقی نے شافعی پر حدیث عبد اللہ بن عمرؓ کے ذریعہ استدراک کیا۔ اور غزالی نے شافعی پر پانی کی نجاست

---

(۱) شرح السنہ، ۷/ ۲۰، مکتب اسلامی بیروت ۱۹۸۳ء

(۲) شرح السنہ، ۹/ ۱۲۷، مکتب اسلامی بیروت ۱۹۸۳ء

(۳) شرح السنہ، حاشیہ، ۹/ ۱۲۷، مکتب اسلامی بیروت ۱۹۸۳ء

کے مسئلہ میں، جب پانی دو قلے سے کم ہو' تفصیلی استدراک کیا ہے، جو 'الاحیاء'[۱] میں مذکور ہے۔نووی نے ایک وجہ ذکر کیا ہے کہ بیع معاطاۃ (لین دین کی شکل میں معاملہ) جائز ہے؛ جب کہ یہ امام شافعیؒ کی صراحت کے خلاف ہے۔

زمخشری [ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر، ۴۶۷-۵۳۸ھ] نے امام ابوحنیفہ پر بعض مسائل میں استدراک کیا ہے۔ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت تیمّم کے سلسلہ میں زمخشری نے کہا:

"زجاج نے کہا کہ 'صعید' کا مطلب زمین کی اوپری پرت ہے، خواہ وہ مٹی ہو یا کچھ اور، چاہے ایسا پتھر ہی کیوں نہ ہو جس پر مٹی نہ موجود ہو۔ پس اگر تیمّم کرنے والے نے اس پر ہاتھ پھیرا اور مسح کرلیا تو اس کو طہارت حاصل ہو جائے گی۔اور یہی امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے۔اور اگر تم نے پوچھا کہ سورہ مائدہ کے اس فرمان الہی کی بابت آپ کیا کہیں گے کہ: "فامسحوا بوجوهكم و أيديكم منه"[۲] [تو مسح کرو اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا اس سے]۔یعنی اس کے حصہ سے۔اور اس فرمان کی تعمیل اس چٹان پر مسح میں نہیں ہوگی جس پر مٹی موجود نہیں ہے۔تو میں کہوں گا کہ اہل علم نے کہا ہے کہ آیت میں مذکور لفظ 'من' ابتداء غایت کے لئے ہے۔لیکن اگر تم پوچھو کہ اہل علم کا یہ کہنا کہ 'من' ابتداء غایت کے لئے ہے' دور از کار قول ہے، اور عرب والے جب کہتے ہیں کہ میں نے سر کا مسح تیل سے اور مٹی سے اور پانی سے کیا تو اس کا مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حصے سے کیا۔تو میں کہوں گا کہ صحیح بات وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو، اور حق بات تسلیم کرلینا بے جا بحث سے بہتر ہے۔"[۳]

اس نوع کے مؤاخذات جو علماء نے اپنے ائمہ پر کئے ہیں، اور خاص طور سے محدثین کے مؤاخذات شمار سے زیادہ ہیں۔میرے استاذ شیخ ابو طاہر شافعی [محمد بن ابراہیم مدنی، ۱۰۸۱-۱۱۴۵ھ] نے اپنے استاذ شیخ حسن عجمی حنفی [۱۰۴۹-۱۱۱۳ھ] کے حوالہ سے مجھے

---

(۱) دیکھئے: احیاء علوم الدین، ۱/ ۱۸۴، دار الکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۳ء

(۲) سورہ مائدہ، آیت ۶

(۳) الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجہ التاویل، ۱/ ۵۴۱، منشورات البلاغۃ، ۱۴۱۵ھ

بیان کیا کہ وہ ہمیں اس بات کا حکم کرتے تھے کہ ہم قلیل نجاست کے معاملہ میں اپنی عورتوں پر سختی نہ کریں، کہ اس میں شدید حرج ہوتا ہے۔ اور ہمیں اس کا بھی حکم دیتے تھے کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل کریں کہ ایک درہم سے کم مقدار کی نجاست معاف ہے۔ اور ہمارے استاذ شیخ ابوطاہر اس قول کو پسند کرتے تھے، اور اس کے قائل تھے۔

[اجتہاد کے لئے مطلوبہ مقدار علم]

'الانوار' میں ہے:

''اجتہاد کی اہلیت اس بات سے حاصل ہوتی ہے کہ چند باتوں کا علم ہو:

اول۔ کتاب اللہ کا علم ہو، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا مکمل علم ہو، بلکہ ان چیزوں کا علم ہو جو احکام سے متعلق ہیں۔ اور یہ بھی شرط نہیں ہے کہ قرآن زبانی یاد ہو۔

دوم۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ہو، یہ بھی مکمل نہیں بلکہ صرف احکام سے متعلق سنت معلوم ہو، البتہ یہ ضروری ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں کے خاص اور عام، مطلق اور مقید، مجمل اور مبین اور ناسخ ومنسوخ سے واقف ہو۔ اور سنت میں متواتر، آحاد، مرسل، مسند، متصل، منقطع اور راویوں کے جرح وتعدیل سے متعلق احوال کا علم ہو۔

سوم۔ علماء صحابہ کرام اور ان کے بعد کے علماء کے اجماعی اور اختلافی اقوال کا علم ہو۔

چہارم۔ قیاس جلی اور قیاس خفی کا علم ہو، اور صحیح قیاس اور فاسد قیاس میں تمیز آتی ہو۔

پنجم۔ عربی زبان کی لغت اور اعراب کا علم ہو۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ان علوم میں تبحر ومہارت حاصل ہو، بلکہ ان کا اجمالی علم کافی ہوگا۔

اور اس بات کی حاجت نہیں ہے کہ علاحدہ علاحدہ احادیث کی جمع وتلاش کی جائے، بلکہ اتنا کافی ہوگا کہ کوئی ایسا صحیح مجموعہ ہو جس میں احادیث احکام جمع کردئے گئے ہیں، جیسے سنن ترمذی اور نسائی اور ان کے علاوہ جیسے ابوداؤد شریف۔ اور یہ شرط نہیں ہے کہ اجماع اور اختلاف کے تمام مقامات پر پوری نظر ہو؛ بلکہ یہ کافی ہوگا کہ جس مسئلہ میں وہ فیصلہ کرنے جارہا ہے، یہ معلوم ہو کہ اس میں اس کی رائے اجماع کے خلاف نہیں ہے، جیسے یہ معلوم ہو کہ اس کی رائے بعض متقدمین کے موافق ہے، یا اس

کو اس بات کا غالب گمان ہو کہ اس مسئلہ میں سابق علماء نے کلام ہی نہیں کیا ہے اور یہ مسئلہ اس کے زمانہ کا نیا پیدا شدہ ہے۔ اسی طرح ناسخ اور منسوخ کی معرفت ہے۔ اور ہر وہ حدیث جس کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع ہے یا جس کے راویوں کی اہلیت پر تواتر پایا جاتا ہے، اس حدیث کے راویوں کی عادل ہونے کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ روایت کے راویوں کی عدالت کی تحقیق کی جائے گی۔ اور ان تمام علوم سے واقفیت کی شرط مجتہد مطلق کے لئے ہے جو شریعت کے تمام ابواب میں فتویٰ دیتا ہے۔ اور یہ درست ہے کہ کوئی شخص ایک باب میں مجتہد ہو، دوسرے باب میں نہیں۔ اور اجتہاد کی شرط یہ بھی ہے کہ اصول اعتقاد سے آگاہی ہو۔ غزالی نے کہا: ان کی معرفت متکلمین کے طریقہ پر ان دلائل کے ساتھ ضروری نہیں ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور اہل بدعت میں سے جس کی گواہی قبول نہیں کی جاتی ہے اس کو منصب قضاء سپرد کرنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح ان کی تقلید درست نہیں ہے، جو اجماع کو نہیں مانتے جیسے خوارج، یا جو اخبار آحاد کو نہیں مانتے جیسے قدریہ، یا جو قیاس کو نہیں مانتے جیسے شیعہ''۔ (۱)

[مسلک کی تبدیلی]

'الانوار' میں یہ بھی ہے کہ:

''مجتہد کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ اس کا مذہب تدوین شدہ ہو۔ اور جب مذاہب مدون ہو گئے تو مقلد کے لئے جائز ہے کہ وہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہو جائے۔ اہل اصول کے نزدیک اگر اس نے ایک مسئلہ میں تقلید کر لی ہے تو اسی مسئلہ میں منتقل ہونا جائز نہیں ہے۔ دوسرے مسائل میں منتقل ہونا جائز ہے۔ اور اگر عمل نہیں کیا ہے تو اس مسئلہ میں اور دوسرے مسائل سب میں منتقل ہونا جائز ہے۔ اور اگر کسی نے کچھ مسائل میں ایک مجتہد کی تقلید کی اور دوسرے مسائل میں دوسرے مجتہد کی تقلید کی تو یہ جائز ہے، لیکن اہل اصول کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ اور اگر ہر مذہب میں آسان تر کو اختیار کیا تو ابو اسحاق کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی

(۱) کتاب الانوار لعمل الابرار، کتاب ادب القضاء

تفسیق کی جائے گی، اور ابن ابو ہریرہ [ابو علی حسن بن حسین، متوفی ۳۴۵ھ] کہتے ہیں کہ تفسیق نہیں کی جائے گی۔ اور اسی کو بعض شروحات میں ترجیح دی گئی ہے۔"(۱)

[مسلک کی جانب انتساب کی قسمیں]

اور 'الانوار' میں ہی ہے کہ:

"امام شافعی، امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد کے مسالک کی جانب انتساب کرنے والوں کی چند قسمیں ہیں:

اول۔ عوام۔ اور ان کا امام شافعی کی تقلید کرنا میت کی تقلید پر متفرع ہے۔

دوم۔ درجہ اجتہاد تک پہنچنے والے۔ اور مجتہد کسی مجتہد کی تقلید نہیں کرتا ہے۔ ان حضرات کا امام کی جانب انتساب اس لئے ہے کہ ان کا طریقہ اجتہاد، دلائل کا استعمال اور دلائل کی باہمی ترتیب امام کے مطابق ہے۔

سوم۔ متوسطین۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درجہ اجتہاد تک نہیں پہنچے؛ لیکن انھوں نے امام کے اصول کو جانا اور اس بات پر قادر ہوئے کہ جو مسائل منصوص نہیں ہیں ان کو ایسے مسائل پر قیاس کریں جو منصوص ہیں۔ ایسے لوگ امام کے مقلد ہیں۔ اور یہی حال ان عوام کا ہے جو ان کے قول کو اختیار کرتے ہیں۔ اور مشہور یہ ہے کہ ایسے لوگ خود مقتدا نہیں ہوتے؛ کیونکہ وہ مقلد ہوتے ہیں۔

ابو الفتح ھروی [نصر بن احمد بن ابراہیم حنفی، ۴۱۹۔۵۱۱ھ] نے جو امام کے تلامذہ میں سے ہیں، فرمایا: اصول میں عام اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ عامی کا کوئی مسلک نہیں ہوتا ہے، اگر اس نے کسی مجتہد کو پایا تو اس کی تقلید کرلے گا۔ اگر مجتہد نہیں ملا اور کوئی مذہب کا متبحر شخص ملا تو اس کی تقلید کرلے گا؛ کیونکہ وہ متبحر شخص اپنے مذہب کے مطابق فتویٰ دیتا ہے۔ یہ اس بات کی صراحت ہے کہ متبحر اپنی ذات میں مقتدا ہوتا ہے۔

اور فقہاء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ جو عامی شخص کسی مسلک کی جانب انتساب رکھتا ہے وہی اس کا مسلک ہے، اور اس کی خلاف ورزی اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ اور اگر عامی کسی مسلک کی جانب انتساب نہیں رکھتا ہو تو کیا اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ

---

(۱) کتاب الانوار لعمل الابرار، کتاب ادب القضاء

اپنے اختیار سے جس مسلک کی چاہے تقلید کر لے؟ اس میں اختلاف رائے ہے، جو دراصل اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ کیا عامی پر کسی ایک متعین مسلک کی تقلید لازم ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں دونوں رائیں ہیں۔ امام نووی کہتے ہیں: دلیل کا تقاضہ یہ ہے کہ عامی پر تعیین لازم نہ ہو؛ بلکہ وہ جس سے چاہے اور جو ملے اس سے مسائل پوچھ لے گا۔ البتہ رخصتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اختیار نہیں کرے گا۔"(۱)

[مفتی جو مجتہد نہ ہو]

'فتح القدیر' کے کتاب آداب القاضی میں ہے:

"جاننا چاہئے کہ مصنف نے جو کچھ قاضی کے بارے میں ذکر کیا ہے، وہی مفتی کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے۔ پس فتویٰ وہی دیں گے جو مجتہد ہوں گے۔ اور اہل اصول کی مستحکم رائے ہے کہ مفتی وہی ہوگا جو مجتہد ہو۔ جہاں تک ایسے غیر مجتہد کا تعلق ہے جو مجتہد کے اقوال کو یاد رکھتا ہے تو وہ مفتی نہیں ہے۔ اور اس پر واجب ہے کہ جب اس سے مسئلہ پوچھا جائے تو وہ مجتہد کا قول اس کے حوالہ سے بیان کرے، مثلاً کہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے ایسا فرمایا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانہ میں جو موجودہ لوگوں کا فتویٰ ہے وہ دراصل فتویٰ نہیں ہے؛ بلکہ وہ مفتی کے کلام کو نقل کرنا ہے، تاکہ سائل اس پر عمل کرلے۔

اور مجتہد کی جانب منسوب کر کے مسئلہ کو نقل کرنا دو میں سے کسی ایک طریقہ سے ہوگا، یا تو اس مسئلہ میں مجتہد تک اس کی اپنی سند ہو، یا پھر وہ مسئلہ کو کسی ایسی معروف کتاب کے حوالہ سے نقل کرے جو لوگوں میں متداول ہے، جیسے امام محمد بن حسن کی کتابیں، یا ان کے علاوہ دیگر مجتہدین کی مشہور کتابیں؛ اس لئے کہ کتاب سے نقل کرنا ان مجتہدین سے خبر متواتر یا مشہور کے درجہ میں نقل کرنا ہے۔ یہی بات رازی نے ذکر کی ہے۔ پس اگر ہمارے زمانہ میں 'نوادر' کا کوئی نسخہ دریافت ہوجائے تو اس کے مضامین کو امام محمد یا امام ابو یوسف کی جانب منسوب کرنا درست نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ نوادر کے نسخے ہمارے دیار اور ہمارے زمانہ میں مشہور نہیں ہیں، اور نہ ہی وہ

---

(۱) کتاب الانوار لعمل الابرار، کتاب ادب القضاء

لوگوں میں متداول ہیں۔ ہاں البتہ اگر نوادر کا کوئی اقتباس کسی مشہور اور معروف کتاب جیسے 'الہدایہ' یا 'المبسوط' میں ملے تو اسے نقل کرنا دراصل اس مشہور کتاب پر اعتماد کرنا ہوگا۔

اگر کوئی شخص مجتہدین کے مختلف اقوال کا حافظ ہو؛ لیکن دلیل نہ جانتا ہو، اور نہ ان اقوال میں ترجیح کے لئے اجتہاد کی قدرت رکھتا ہو تو وہ ان میں سے کسی ایک قول کو قطعیت نہیں دے گا اور نہ اس پر فتویٰ دے گا؛ بلکہ ان اقوال کو مستفتی کے سامنے بیان کردے گا، اور مستفتی ازخود ایسا قول اختیار کرلے گا جس کی صحت پر اس کا دل مطمئن ہوجائے۔ یہ رائے بعض جوامع میں ذکر کی گئی ہے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ ایسا شخص مستفتی کے سامنے تمام اقوال کو بیان نہیں کرے گا؛ بلکہ اتنا کافی ہوگا کہ ان میں سے کوئی ایک قول مستفتی کو بیان کردے، کیونکہ مقلد کو یہ حق ہے کہ وہ جس مجتہد کی چاہے تقلید کرے۔ تو جب اس کے سامنے اس نے ایک قول بیان کردیا اور مستفتی نے اس کی تقلید کرلی تو مقصود حاصل ہوگیا؛ البتہ بتانے والا قطعیت کے ساتھ یوں نہیں کہے گا کہ تمہارے مسئلہ کا جواب یہ ہے؛ بلکہ یوں کہے گا کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ اس مسئلہ کا یہ حکم ہے؛ لیکن اگر وہ تمام اقوال کو نقل کرتا ہے تو عامی کے لئے وہ قول اختیار کرنا بہتر ہے جو اس کے دل میں زیادہ صحیح معلوم ہو؛ حالانکہ کسی قول کے صواب یا خطا ہونے کے سلسلہ میں عامی کے دل کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ اسی لئے اگر عامی نے دو فقیہ یعنی دو مجتہد سے مسئلہ پوچھا، اور اس میں دونوں مجتہدین کی رائیں مختلف ہوئیں تو اولیٰ یہ ہے کہ عامی ان دونوں میں سے جس کی طرف دل مائل ہو اسے اختیار کرلے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ اگر عامی نے اس مجتہد کا قول اختیار کیا جس کی طرف دل مائل نہیں تھا تو بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ عامی کا میلان اور عدم میلان دونوں برابر ہیں۔ اس پر صرف اتنا واجب ہے کہ وہ کسی مجتہد کی تقلید کرلے، اور اس نے یہ کرلیا۔ خواہ اس مجتہد کی رائے صحیح ہوئی ہو یا خطا۔

فقہاء کہتے ہیں کہ ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی جانب اجتہاد اور برہان کے ذریعہ منتقل ہونے والا گنہ گار اور مستحق تعزیر ہے، تو اجتہاد و برہان سے پہلے منتقل ہونا

بدرجہ اولی گناہ ہے۔ اور ضروری ہے کہ یہاں اجتہاد سے مراد تحری (غور و اندازہ) اور تحکیم قلب (دل کا فیصلہ) کا مفہوم لیا جائے؛ اس لئے کہ عامی کو اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی جانب منتقلی فی الواقع اس خاص مسئلہ کے حکم میں متحقق ہوگی جس میں اس نے تقلید کرتے ہوئے عمل کرلیا، ورنہ صرف یہ کہنا کہ مثلاً میں نے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کی ان تمام مسائل میں جن میں انھوں نے فتویٰ دیا، اور میں نے ان پر عمل کا التزام کیا؛ جب کہ وہ ان مسائل کی صورتوں سے واقف بھی نہیں ہے، یہ حقیقتاً تقلید نہیں ہے؛ بلکہ یہ تقلید کی تعلیق یا اس کا وعدہ ہے، گویا اس نے اس بات کا التزام کیا کہ وہ ان تمام مسائل میں جو اس کو متعین واقعات میں پیش آتے رہیں گے، امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرے گا۔ پس اگر فقہاء کی مراد یہی التزام ہے، تو ایسی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے کہ اپنے اوپر زبانی اقرار یا نیت کے ذریعہ ایک متعین مجتہد کی اتباع لازم کرلینے سے وہ واجب ہوجاتی ہے۔ دلیل صرف اس بات کی متقاضی ہے کہ ضرورت پیش آنے پر وہ مجتہد کے قول پر عمل کرلے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون"(۱) [اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو]، اور سوال اسی وقت درپیش ہوتا ہے جب کسی متعین واقعہ کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت پیش آجائے، تو اس وقت اس کے نزدیک مجتہد کا قول ثابت ہوجائے تو اس پر عمل اس کے لئے واجب ہوگا۔ اور غالب یہ ہے کہ فقہاء کی جانب سے اس طرح کی پابندیاں لوگوں کو تتبع رخص (سہولتوں کی تلاش) سے روکنے کے لئے ہوتی ہیں؛ ورنہ عامی شخص ہر مسئلہ میں ایسے مجتہد کا قول اختیار کرے گا جو اس پر آسان ہو۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ نقل اور عقل کی کون سی دلیل اس بات میں مانع ہے۔ انسان اگر ایسے مجتہد کا 'جس کے لئے اجتہاد درست ہے، وہ قول اختیار کرتا ہے جو اس کے لئے آسان تر ہو تو مجھے نہیں معلوم کہ شریعت میں اس پر کوئی مذمت کی گئی ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ تو اپنی امت کے لئے تخفیف کو پسند فرماتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔"(۲)

---

(۱) سورہ نحل، آیت ۴۳۔

(۲) فتح القدیر، کتاب ادب القاضی ۷/۷ ۲۳۔۹ ۲۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۵ء

تصحیح نامہ

صفحہ و سطر نمبر		غلط	صحیح
۸	۱۲	اب یہ ہدیہ قارئین ہے	اب قریب الطبع ہے
۲۳	۱۰	۳۲۶-۷۵۵	۶۲۳-۵۵۷
۲۳	۱۱	۶۷۶-۱۳۶	۶۷۶-۶۳۱
۲۳	حاشیہ	۰۱/۰۲۱-۲۲۱	۱۰/۱۲۰-۱۲۲
۲۳	حاشیہ	۳۸۹۱	۱۹۸۳
۲۸	۹	اور ان سے	ان سے
۳۳	۸	۳۸۸-۳۱۱۹	۳۸۸-۳۱۹
۴۴	۱۴	---	(یہ پورا پیراگراف اقتباس کا حصہ ہے)
۵۶	۱	۵۰۸-۷۲۴	۸۰۵-۷۲۴